www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2017، قیمت:- /10₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ،اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ:15 روپے، سالانہ:150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

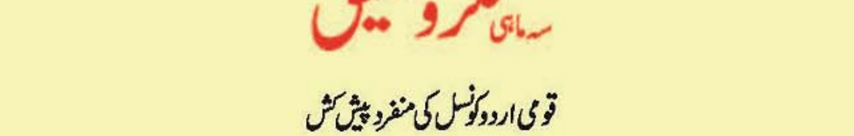

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون:26109746، فیکس:26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

جلد: 5 شمارہ: 12 دسمبر 2017

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون: 26109746
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
مضامین	مولا بخش	مختار ٹونکی	06
	اقوام متحدہ: اغراض ومقاصد	اختر حسین آفتاب	08
نظم	اپنے بچے کے نام	خلیل الرحمن اعظمی	10
مضمون	شاندار درخت: سال	مسرت جہاں	11
نظم	پرندہ	سید بشیر احمد بشیر	14
مضمون	سیلفی اور اس کے نقصانات	انصاری اسماسلیم	15
نظمیں	ٹافی انکل	شبیر اصغر	19
	میری سائیکل	راحت حسن	20
کہانیاں	میری سال گرہ	حجاب امتیاز علی	21
	صفائی مہم	بانو سرتاج	28
	بلّی نے درخت پر چڑھنا کیسے سیکھا؟	عبدالناصر	31
نظمیں	کیسے سمجھاؤں نانی کو	شاد فاطمہ بنت ناصر خان	35
	شترمرغ	امان الحق	36
کہانی	زینب کی چڑیاں	زیبا فاروقی	37
نظم	سردی	فردوس بانو فلاحی	40
باتصویر کہانی	کھانے کی کھیر	ذکیہ مشہدی	41
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	46
کہکشاں	اقوال زریں	سید مرتضیٰ سید خالق	52
	علم اور عقل	واثق محمد فضل اللہ دروی	52
	آئن اسٹائن کی ایک نایاب تصویر	محمد سلطان	53
	مزاحیہ پیغام	سیدہ مظہر سلطانہ	54
	علم	مہوش امجد خان	54
	آؤ اردو سیکھیں		55
ننھے فنکار	آبدوز کی تاریخی اہمیت	محمد طاہر صدیقی	58
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! دسمبر کا یہ شمارہ جب آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا تب تک سردیاں شروع ہو چکی ہوں گی۔ سردی کا موسم یوں تو بہت سہانا لگتا ہے کیونکہ اس موسم کا اپنا الگ ہی لطف ہے۔ لیکن جو بچے اسکول یا کالج جاتے ہیں ان کے لیے سردیوں میں تھوڑی مشکلیں بڑھ جاتی ہیں۔ سردی کے موسم میں صبح سویرے اٹھنے میں بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے مگر اس کے باوجود بھی ننھے منے بچے اسکول کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ علم کی گرمی انھیں سردی کی شدت محسوس نہیں ہونے دیتی۔

ویسے دیکھا جائے تو گرمی کے مقابلے میں سردی کا موسم صحت کے لیے مناسب ہوتا ہے۔ اس موسم میں اگر متوازن غذا لی جائے تو انسان بیمار نہیں پڑتا۔ بس ذرا ٹھنڈ سے بچنے کی ضرورت ہے۔ سردیوں کا موسم جہاں بہتوں کے لیے رحمت ہے وہیں بہت سے لوگوں کے زحمت کا باعث بھی ہے۔ ہم سب تو گرم سوئٹر، جیکٹ اور خوبصورت کمبلوں میں دبک کر سردی کو خوب انجوائے کرتے ہیں لیکن دوسری طرف ملک کی بڑی آبادی سڑک کے کنارے جھگیوں میں غربت میں گزارہ کرتی ہے۔ ان کے پاس سوئٹر تو دور کی بات تن ڈھکنے کو بھی کپڑے نہیں ہوتے۔ بہت سے غریب بچے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے آپ کو اپنے علاقے میں نظر آجائیں گے جنھیں دیکھ کر آپ کو ترس بھی آتا ہوگا۔ اب ایسی حالت میں کیا ہم سب کا یہ فرض نہیں بنتا کہ ہم اپنی اپنی سطح پر ان غریب اور بے سہارا بچوں کا خیال کریں اور اپنی وسعت کے مطابق ان کی مدد کریں۔ ان کے کام آئیں۔ اگر ہمارے گھر میں پرانے گرم کپڑے، سوئٹر، جیکٹ اور کمبل ہیں جو ہمارے استعمال میں نہیں آتے تو ہمیں چاہیے کہ ایسے کپڑے غریب و مجبور لوگوں کو دے دیں تا کہ سردی سے وہ بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ آپ کی ایک چھوٹی سی کوشش مجبور اور بے سہارا لوگوں کے حق میں کتنی مفید ثابت ہوگی یہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہر سال سردیوں سے سیکڑوں افراد موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک اچھی خاصی تعداد سردی کی وجہ سے اپنی جان کھو بیٹھتی ہے۔ آپ کی ذرا سی قربانی، بیداری سے اگر کسی کی جان بچ جاتی ہے تو اس سے زیادہ نیک کام اور کیا ہو سکتا ہے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دنیا میں درجنوں ایسے ممالک اور علاقے ہیں جہاں سال بھر سردی رہتی ہے اور ایسی کڑاکے کی سردی کہ گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے لیکن وہاں کے باشندے ایسے موسم میں بھی گزارہ کرتے اور خوش رہتے ہیں۔ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم ایسے علاقے یا ملک میں رہتے ہیں جہاں ہمیں کئی موسم نصیب ہیں جن کا ہم بھرپور مزہ لیتے ہیں۔

بچو! سردیوں میں گجک، مونگ پھلی، گرما گرم کافی اور چائے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ گاجر کے حلوے اور گلاب جامن کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔ اس موسم میں ان چیزوں کا لطف لیں اور سردی سے محفوظ رہیں۔ رضائی میں چھپ چھپ کر اپنے آپ کو موبائل میں مصروف رکھنے کے بجائے خوب دل لگا کر پڑھائی کریں کیونکہ موبائل زندگی کو تباہ کرنے کا ایک ذریعہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس سے بہت سارے خاندان بربادی کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم اچھی زندگی اور بہتر مستقبل کی ضمانت ہے اس لیے اپنے مستقبل پر دھیان دیں اور ملک و قوم کا نام روشن کریں۔

اب آپ 'بچوں کی دنیا' کا مطالعہ کریں۔ اس شمارے میں ہم نے سردی پر ایک نظم بھی شامل کی ہے جو آپ سب کو پسند آئے گی۔ اس کے علاوہ معلوماتی مضامین اور کہانیاں بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔ آپ اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ کریں اور سردی کے موسم میں آپ کی کیا سرگرمیاں رہیں یہ ہمیں لکھ بھیجیں۔ ہم 'بچوں کی دنیا' میں آپ کے خیالات ضرور شائع کریں گے۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

’بچوں کی دنیا‘ اکتوبر کے شمارے میں استادِ محترم رفیق ابراہیم پرکار صاحب کا تبصرہ نظر سے گذرا۔ ان کا بے حد شکریہ! انھوں نے ایک اہم گوشے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ادبِ اطفال اور سائنس میں اساسی فرق یہی ہے کہ اول الذکر وسیلے سے زیادہ مقصد اور پیغام کا متلاشی اور خوگر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوربین ہونے کے علاوہ جادہ نما اور منزل نما بھی ہوتا ہے۔ ”ایک دکھ بھری کہانی کا بنیادی مقصد تلاش و جستجو اور کھوج و تحقیق کی طرف راغب کرنا ہے۔ اور یہ بات تو استادِ محترم پرکار صاحب بھی تسلیم کریں گے کہ یہ کہانی اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ دراصل کہانی کہانی ہوتی ہے۔ اس میں حقائق کا تناقض عیب سہی لیکن اُسے سائنس کی سخت گیر کسوٹی پر آنکا نہیں جا سکتا۔ اگر ایسا ہوا تو ایسپ کی کہانیاں ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائیں گی۔ ابو خاں کی چاندنی اور سونے چاندی کی کلہاڑیاں پانے والے غریب لکڑہارے اور ظالم شیر کو کنویں میں چھلانگ لگانے پر مجبور کرنے والے عقلمند خرگوش اور اس کے علاوہ ادبِ اطفال کے سیکڑوں زندہ و جاوید کردار بے معنی اور لایعنی ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ حقائق اور سچائی کے فقدان کے باوجود یہ کہانیاں اپنے اندر موجود ہر دم تر و تازہ رہنے والے مقصد اور پیغام کی بدولت صدیوں سے راج کر رہی ہیں اور آئندہ بھی راج کرتی رہیں گی اور اپنا حلقۂ اثر صدیوں اور نسلوں کو منتقل کرتی رہیں گی۔

اقبال برکی، مالیگاؤں، مہاراشٹر

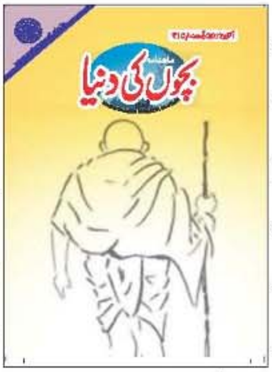

اکتوبر کے شمارے میں ’ہمت کی ہمالہ‘ ام الخیر کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ایسے مضامین بچوں کے حوصلے مضبوط کرتے ہیں۔ اس کی زندگی ایسے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے جو اپنی راہ میں آنے والی مشکلات سے گھبرا جاتے ہیں۔ لیکن ام الخیر نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر ارادے پختہ ہوں اور محنت و لگن جاری رکھیں تو پھر منزل ملنے میں دیر نہیں لگتی۔ اسی طرح بچوں کی دنیا میں مہاتما گاندھی سے متعلق لکھی گئی تمام تحریریں بہت پسند آئیں۔ ’زمین کی تہہ میں‘ ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔

ناظرہ بانو، ڈومن پورہ کساری، مئوناتھ بھنجن، یوپی

ماہ نامہ ’بچوں کی دنیا‘ بڑی پابندی سے گھر آتا ہے اور میرے پوتے، پوتیاں اور نواسیاں توجہ سے پڑھتے ہیں۔ یہ بچے ہفتم تا نہم درجے میں پڑھتے ہیں اور خوب مزے لیتے ہیں۔ ’بچوں کی دنیا‘ جس طرح پسند کیا جا رہا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔

غلام احمد خان (ملک بزمی)، گولڈی ایجنسی، ماجلگاؤں روڈ، مہاراشٹر

سرزمین مالیگاؤں ناسک جو اردو زبان کے چاہنے والوں کی سرزمین ہے اسی شہر میں قومی اردو کونسل کی جانب سے کتاب میلہ بھی منعقد ہوا۔ یہاں ہر گھر کے افراد و بچوں کو ہر ماہ بے صبری سے ’بچوں کی دنیا‘ کا انتظار رہتا ہے۔ مہاراشٹر میں بچوں کی دنیا اسی شہر میں لوگ زیادہ خریدتے ہیں۔

محبان بچوں کی دنیا، مالیگاؤں، مہاراشٹر

مختار ٹونکی

مولا بخش

ایک زمانہ تھا کہ ہاتھیوں کی ریل پیل اور دھوم دھام تھی۔ پہلے جب زمینی اور میدانی لڑائیاں لڑی جاتی تھیں تو فوجیوں کی پہلی قطار میں ہاتھیوں کا دستہ بھی ہوا کرتا تھا۔ پھر ہاتھی شادی بیاہ کے موقعوں پر دیکھے جانے لگے اور سرکس میں بھی کرتب دکھاتے رہے۔ ہاتھی اونچا اور قد آور جانور ہے اور شان کی سواری ہے۔ اس لیے راجاؤں اور بادشاہوں تک بھی اس کی پہنچ تھی۔ مغلیہ دورِ حکومت کی بات ہے کہ ایک ہاتھی تھا جومولا بخش کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بڑا بھاری بھرکم اور بلند قامت کئی بادشاہوں نے اس پر سواری کی تھی۔ کہتے ہیں کہ مولا بخش اتنا اونچا تھا کہ لال قلعے کے داخلی دروازے لاہوری گیٹ سے ہودے سمیت نہیں گزر سکتا تھا۔ اس لیے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے لاہوری دروازے کو تڑوا کر اتنا اونچا کروادیا تھا کہ وہ مع سواری اور عماری بہ آسانی گزر جائے۔

مولا بخش کو اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ایک سوداگر لایا تھا۔ اس کے فیل بان بخارا کے ایک سید تھے۔ مولا بخش بہادر شاہ کے زمانے میں تھا تو بوڑھا مگر تندرست و توانا تھا۔ ہر وقت مست رہتا تھا اور اپنے مہاوت کے علاوہ کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتا تھا لیکن ایک دن مستی میں آکر اور سید صاحب کو غافل پا کر مولا بخش نے انھیں اپنی سونڈ اور پیروں کے ذریعے چیر پھاڑ ڈالا تھا۔ سید صاحب کی بیوی کو جب یہ غمناک خبر ملی تو وہ بیچاری اپنے ڈیڑھ دو سالہ گود کے بچے کو لے کر روتی پیٹتی آئی اور اسے مولا بخش کے سامنے ڈال دیا کہ اسے بھی کچل ڈالے تب تک مولا بخش کی مستی اتر چکی تھی۔ اس نے بچے کو غور سے دیکھا اور سونڈ سے اٹھا کر اپنی گردن پر بٹھالیا۔

فطرت سے شریر اور چنچل ہونے کے باوجود اس میں اس روز سے حیرت انگیز تبدیلی آگئی۔ وہ سید صاحب کے بچے رحمت علی کے ساتھ دوسرے بچوں کو بھی پسند کرنے لگا۔ مولا بخش کی خوراک کے لیے تین تین انچ موٹی روٹیوں کا راتب تیار کیا جاتا تھا اور گنوں کی بھاریاں لائی جاتی تھیں لیکن وہ تب تک روٹی کو منہ نہیں لگاتا تھا اور گنے نہیں توڑتا تھا جب تک کہ بچے اس کے ناشتہ میں شریک نہ ہوں۔ قلعے کے آس پاس کے بچے گنوں کے لالچ میں اور اس پر سواری کے شوق

میں اس کے ارد گرد جمع ہوجاتے تھے۔ بچوں کی صحبت میں وہ خوش رہتا اور اپنی سونڈ سے انھیں گنے اٹھا اٹھا کر دیتا۔ جس دن بچے نہ آتے وہ شور مچاتا اور چنگھاڑتا اور اپنی خوراک سے بھی منہ موڑ لیتا۔ میر باقر علی دہلوی نے لکھا ہے کہ بادشاہ اور مولا بخش دونوں کا مزاج ایک جیسا تھا۔ بادشاہ خدا کی بخشی ہوئی نعمت کو عوام میں بانٹ کر کھاتا تھا تو مولا بخش اپنی خوراک کو بچوں میں مل بانٹ کر کھاتا تھا۔

ایک بادشاہ نے نئے فیل بان کی شکایت پر یہ سوچ کر کہ کہیں کسی موقع پر بچوں کو نقصان نہ پہنچا دے، اپنے حکم نامے کے ذریعے پابندی لگا دی کہ بچوں کو اس کے پاس پھٹکنے بھی نہ دیا جائے۔ بس مولا بخش نے بھی کھانا پینا بند کر دیا اور احتجاج کے طور پر چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ کہا گیا ہے کہ تین روز تک اس کی بھوک ہڑتال جاری رہی۔ یہاں تک کہ مہاوت کی صورتِ حال کہنے پر بادشاہ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔

کچھ بھی ہو مولا بخش اپنے مالک یعنی بادشاہ سلامت کا بہت وفادار تھا۔ جب بھی وہ بادشاہ کے روبرو ہوتا تو دونوں گھٹنے ٹیک کر اور سر جھکا کر سلام کرتا تھا اور بادشاہ کے سوار ہونے پر نہایت ادب سے شاہانہ انداز سے چلتا تھا۔ 1857 میں جب آزادی کی پہلی لڑائی ہوئی اور انگریز قلعے پر قابض ہو گئے تو بادشاہ بہادر شاہ نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ بادشاہ کے نظروں سے اوجھل ہونے اور بچھڑنے سے مولا بخش کو اس قدر صدمہ ہوا کہ اس نے ایک بار پھر کھانا پینا چھوڑ دیا۔ قلعہ کے نئے انگریز انچارج سانڈرس کو جب یہ خبر پہنچائی گئی تو اس نے اس کی من بھاتی خوراک کا انتظام کیا اور ٹوکروں میں بھر کر اس کے سامنے رکھوائی مگر مولا بخش نے اپنی سونڈ سے وہ ٹوکرے اٹھا اٹھا کر پھینک دیے۔ یہ دیکھ کر سانڈرس غصہ میں بولا تھا کہ یہاں تو بادشاہ ہی نہیں ہاتھی بھی باغی ہے۔

بعد میں سانڈرس نے ہاتھی کو نیلام کرنے کا حکم دیا۔ مولا بخش کو بازار میں لے جا کر کھڑا کیا گیا۔ بولی کون لگاتا افراتفری کا عالم تھا۔ بالآخر ایک پنساری نے ڈھائی سو روپے کی بولی لگائی اور اسے مولا بخش کو سونپنے کا فیصلہ ہوا۔ فیل بان بھی مجبور تھا کیا کرتا۔ اس نے افسردگی اور بیچارگی سے کہا تھا کہ مولا بخش ہم دونوں نے بادشاہ کی بہت غلامی کر لی لیکن اب تمھیں ہلدی بیچنے والے کے دروازے پر حاضری دینی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ ہاتھی مولا بخش کو اپنی یہ نیلامی اور رسوائی پسند نہ آئی۔ مہاوت نے جو کہا اس نے سنا یا نہیں سنا ہو مگر وہ دھڑام سے نیچے گرا اور مر گیا..... ہاتھی تو اپنے زمانے میں بہت سے پیدا ہوئے اور مرے ہوں گے مگر مولا بخش کا نام تاریخ کے اوراق میں آج بھی زندہ ہے۔

■

Mukhtar Tonki
Kali Pattan Road, Pul Mohd Khan
Tonk - 304001 (Rajasthan)

اختر حسین آفتاب

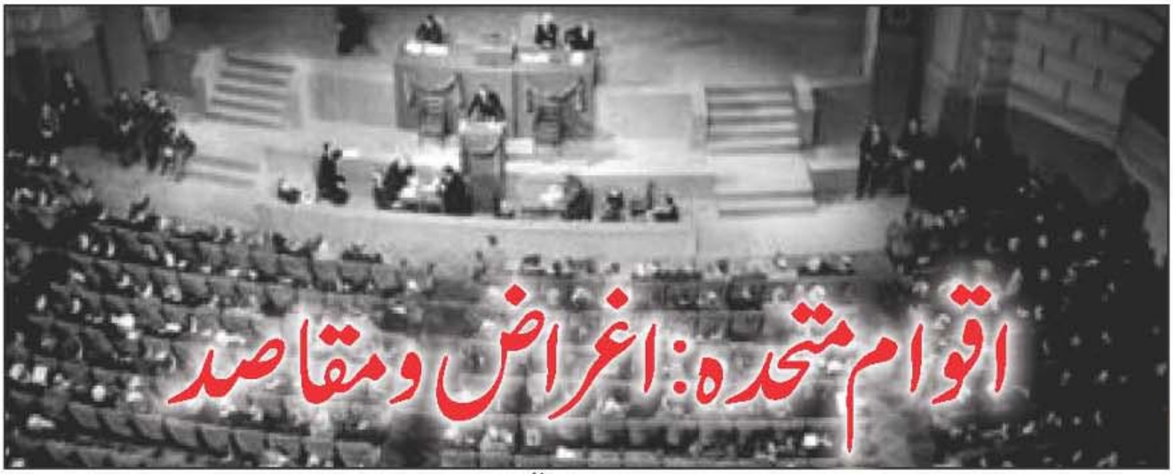

اقوام متحدہ: اغراض ومقاصد

26 جون 1945 کو سان فرانسسکو میں چند ممالک کے نمائندوں نے ایک عہدنامہ پر دستخط کیا۔ اِس عہدنامہ میں اس بات کا اظہار کیا گیا کہ ایسی وطن پرستی جس کے نتیجے میں دو عالمی جنگیں ہوئیں وہ ناقابل قبول ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ بین الاقوامی کنٹرول کے ذریعے جنگوں کو روکا جاسکتا ہے اور عالمی پیمانے پر امن کی فضا بحال کی جاسکتی ہے۔ اقوام متحدہ کا نام امریکہ کے سابق صدر فرینکلن روزویلٹ کی تجویز پر رکھا گیا تھا۔

24 اکتوبر 1945 کو اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ 24 اکتوبر کو دنیا بھر میں ہر سال اقوام متحدہ کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے اغراض و مقاصد:

(1) آنے والی نسل کو جنگ کے شعلوں سے بچانا۔
(2) انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرنا۔
(3) ایسے حالات پیدا کرنا جس کے تحت قومیں آپسی جھگڑوں کو قانون اور انصاف کی فضا میں حل کرسکیں اور جنگ نہ کریں۔
(4) قوموں کا معیار زندگی بلند ہو اور سماجی اعتبار سے وہ آگے بڑھیں۔

اقوامِ متحدہ کا صدر دفتر نیویارک امریکہ میں ہے۔ اقوام متحدہ کا ایک اہم دفتر جنیوا میں بھی ہے جہاں کبھی کبھی اہم میٹنگیں ہوا کرتی ہیں۔

اقوام متحدہ کا ایک افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔ اُسے سکریٹری کہا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی کارگزاری کا ذمے دار وہی ہوتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہورہا ہے اس پر اس کی پوری نگاہ ہوتی ہے چند برسوں کے بعد نئے سکریٹری جنرل کا چناؤ ہوتا ہے۔ آجکل انٹونیو گوتیرس (Antonio Guterres) یو این او کے سکریٹری جنرل ہیں۔ یہ نویں سکریٹری جنرل ہیں۔ اقوام متحدہ کی ایک کونسل بھی ہوتی ہے جسے سیکوریٹی کونسل کہتے ہیں۔ اس کے 11 ممبران ہوتے ہیں۔ 5 مستقل اور 6 غیر مستقل۔ مستقل ممبران کو ویٹو Veto کا حق حاصل ہوتا ہے۔ غیر مستقل ممبران کو ویٹو (Veto) کا حق حاصل نہیں ہے۔

مستقل ممبران کا تبادلہ نہیں ہوتا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی ایک اسمبلی ہوتی ہے جسے جنرل اسمبلی کہتے ہیں۔ ہر ملک جو اقوام متحدہ کا ممبر ہے اس اسمبلی کا بھی ممبر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دنیا کے الجھے ہوئے مسائل اس اسمبلی کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور ووٹ کے ذریعے فیصلہ ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کی ایک عدالت بھی ہے جسے عالمی عدالت International court of Justice کہتے ہیں۔ اگر دو

ملکوں کے درمیان تکرار ہے تو دونوں فریق اپنا کیس اس عدالت میں پیش کرسکتے ہیں۔

اِس کے علاوہ بھی اقوامِ متحدہ کی بہت ساری شاخیں ہیں مثلاً یو این ای ایس سی او، ڈبلیو ایچ او، آئی ایل او، ایف اے او، ورلڈ بینک، چلڈرینز فنڈ— یہ سبھی شاخیں دنیا کے مختلف ممالک میں انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف ہیں۔

آج جوہری ہتھیاروں کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ دفاع پر ہر سال بجٹ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دوسری طرف انسان کی بہت بڑی تعداد امراض، بھوک اور فاقے سے تڑپ رہی ہے۔

امریکہ نے سب سے پہلا ایٹم بم 16 جولائی 1945 کو تجربہ کیا۔ 6 اگست 1945 کو امریکہ نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا۔ سوویت یونین نے 23 ستمبر 1949 کو پہلا ایٹمی تجربہ کیا۔ 1 نومبر 1952 کو امریکہ نے پہلا ہائیڈروجن بم کا تجربہ کیا۔ 12 اگست 1953 کو برطانیہ نے بحرالکاہل میں ہائیڈروجن بم ٹسٹ کیا۔ 13 فروری 1960 کو فرانس نے سہارا ریگستان میں ایٹمی تجربہ کیا۔ 16 اکتوبر 1964 کو چین نے ایٹمی ہتھیار کا تجربہ کیا۔ اگر ایٹمی ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی مانگ پر روک نہ لگائی گئی تو سوچیے دنیا کا کیا ہوگا۔ اگر ایٹمی ہتھیار استعمال ہوئے تو انسانی تہذیب مٹ جائے گی، انسانی تمدن ختم ہوجائے گا اور انسان نے ہزاروں برسوں میں جو بھی حاصل کیا ہے وہ چند منٹوں میں خاک اور راکھ میں تبدیل ہوجائے گا۔ ہمیں انسانیت کو جنگ سے بچانا ہے۔

امن کا مطلب صرف جنگ کا نہیں ہونا نہیں ہے۔

امن کا مطلب انسانی بھائی چارہ کے ہیں۔ ہر انسان نسل، قوم، عقیدہ اور علاقے سے اوپر اٹھ کر ہر انسان کا احترام کرے۔ ہم انسان ہیں اس لیے سبھی انسان چاہے وہ کسی بھی مذہب و ملت کے ہوں ہمارے بھائی ہیں۔

اقوامِ متحدہ ایک قوم کو دوسری قوم کے ساتھ جوڑنے کی بھرپور کوشش کرتی چلی آرہی ہے۔ 1946 میں اقوامِ متحدہ کے ممبران کی تعداد کل 51 تھی۔ آج اس کے کل ممبران 193 ہیں۔ اقوامِ متحدہ نے Congo میں امن بحال کرنے کے لیے امن فورس بھیجی۔ اقوامِ متحدہ نے عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی کرائی۔ اقوامِ متحدہ نے یونان اور ترکی کے بیچ جنگ بندی کرائی۔

آج دنیا میں چند مسائل ایسے ہیں جنھیں اقوامِ متحدہ حل نہیں کرپائی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقوامِ متحدہ ناکام ہوگئی۔ اقوامِ متحدہ کا وجود اپنے آپ میں عالمی پیمانے پر امن اور شانتی بحال کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

اقوامِ متحدہ کا پیغام جو محبت اور عالمی بھائی چارہ ہے دنیا کے سبھی ممالک کے دلوں میں سماجائے جوہری ہتھیاروں کو ختم کردیا جائے۔ دفاع پر اخراجات کو گھٹایا جائے اور دنیا سے غریبی، بھک مری اور بیماری کو مٹا دیا جائے اور انسانی زندگی کے معیار کو بلند سے بلندتر بنانے کی کوشش کی جائے۔

نئی دہلی 12 اپریل 1967 کو ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن نے اقوامِ متحدہ کے جنرل سکریٹری U Thant کے اعزاز میں منعقدہ پروگرام میں کہا تھا۔ تقریر کے الفاظ ذیل میں درج ہیں:

"دنیا میں ہر دل اور دماغ میں محبت نقش ہوجانی چاہیے۔"

■

Akhtar Hussain Aftab
Sandalpur, New Azimabad Colony
Patna - 800006 (Bihar)

خلیل الرحمن اعظمی

اپنے بچے کے نام

اے مرے سن و سال کے حاصل
میرے آنگن کے نودمیدہ گلاب
میرے معصوم خواب کے ہم شکل
میری مریم کے سایۂ شاداب
صبح تخلیق کا سلام تجھے
زندگی تجھ کو کہتی ہے آداب

اے مقدس زمیں کے شعلۂ نو
تو فروزاں ہو ان فضاؤں میں
میرے سینے کی جو امانت ہیں
جو مری نارسا دعاؤں میں
اس طرح مسکراتی ہیں جیسے
نغمگی دور کی صداؤں میں

مجھ کو اجداد سے وراثت میں
وہ خرابے ملے کہ جن میں رہا
عمر بھر پائمال و خاک بسر
میرا حصہ رہا غمِ فردا
مجھ کو میرے لہو میں نہلا کر
جس نے قیدِ حیات میں رکھا

اے مری روحِ فن کے عکسِ جمیل
تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے
جو نہ میں ہوسکا وہ تو ہوجائے
کاش تو میرا جانشیں نہ بنے
میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا
ان دیاروں میں تیرا نام چلے

الفاظ و معانی

سن	عمر	نودمیدہ	نیا کھلا ہوا، شگفتہ
ہم شکل	ملتا جلتا چہرہ	شاداب	ہرا بھرا
صبح تخلیق	پیدائش کی صبح	مقدس	پاک صاف
فروزاں	روشن، چمکدار	نارسا	نا پہنچنے والی
صداؤں	آوازوں	اجداد	'جد' کی جمع 'دادا
وراثت	اجداد کی چھوڑی ہوئی چیزیں	خرابے	ویران مکان، کھنڈر
پائمال	روندے ہوئے، کچلے ہوئے	خاک بہ سر	سر پہ مٹی
فردا	آنے والا کل	عکس جمیل	خوبصورت عکس
جانشین	نائب، ذمے داری، اٹھانے والا		

ماخذ: منتخب قومی شاعری، مرتبہ: سردار جعفری، ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

مسرت جہاں

شاندار درخت: سال

شمالی ہندوستان میں پایا جانے والا 'سال' ایک شاندار درخت ہے۔ یہ 20 سے 25 میٹر تک بلند ہوتا ہے، اور کبھی کبھی وادیوں میں اگنے والے سال کے درخت کی اونچائی 40 میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ درخت گنگا برہمپتر میدان کے شمال اور جنوب میں پائے جانے والے گھنے جنگلات میں اُگتا ہے۔ ملک میں اُگنے والے سال کے سارے جنگلات کا چار پانچواں حصہ مدھیہ پردیش، اُڑیسہ اور بہار میں پایا جاتا ہے اور بقیہ اتر پردیش، مغربی بنگال اور آسام میں ہمالیائی سلسلے کی ڈھلانوں میں ملتا ہے۔

اگر آپ کبھی سال کے جنگل سے گزرے ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر طرف سال ہی سال کے درخت اُگے نظر آتے ہیں۔ یہ کافی بڑے رقبے میں خود ہی اگتا ہے۔ یہاں دوسری اقسام کے درخت لگ بھگ نہ کے برابر اگتے ہیں۔ سال کے جنگلات میں ہونے والی کوئی بھی تبدیلی ہم کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ موسم سرما میں سارا جنگل سنہرا ہو جاتا ہے۔ پرانی پتیاں گرنے لگتی ہیں۔ نئی پتیاں نکلنے پر سارا کا سارا جنگل چمکدار سرخ ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کا رنگ دلکش ہرا ہو جاتا ہے۔ درختوں پر لگے پھول نہایت جاذب نظر ہوتے ہیں۔ سارے جنگل میں ہر طرف مسرت کا ماحول ہوتا ہے اور جب بارش کی شروعات ہوتی ہے تو ہزاروں کی تعداد میں اس کے پھل زمین پر بکھر جاتے ہیں۔ یہ اپنے نازک پتوں سے پھسلتے ہوئے نہایت لطیف انداز میں نیچے گر جاتے ہیں۔ سال کے پھل بہت جلد پھوٹنے لگتے ہیں۔

اگر ایک ہفتہ بارش نہ ہو تو یہ پھل سڑ جاتے ہیں۔ ان پھلوں میں گودے دار گٹھلی ہوتی ہے۔ 1897 کے قحط میں قبائلی لوگوں کے لیے یہ ایک نہایت اہم خوراک ثابت ہوئی تھی۔ آج کل ان کا استعمال چاکلیٹ بنانے میں ہوتا ہے۔ بہار، مدھیہ پردیش اور اڑیسہ کے کچھ حصوں میں سال پر قدرت کی خاص

مہربانی ہے کیونکہ یہاں پر پرانے درختوں کے نیچے نئے سال کے درخت خودرو گھاس کی طرح خودبخود اُگ آتے ہیں۔ یہاں صرف اتنا کرنا ضروری ہوتا ہے کہ پرانے درختوں کی عمر پوری ہونے پر انھیں گرا دیا جائے۔ نئے درختوں سے لکڑی حاصل کرنے سے پہلے ہی یہ عمل کیا جاتا ہے۔ نئی فصل کی سویا سو سے بھی زیادہ سالوں تک دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

اترپردیش میں سال کو اگنے کے لیے نہایت سخت اور ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں پرانے درختوں کے نیچے بہت کم نئے پورے اگتے ہیں کیونکہ جانوران کو چر جاتے ہیں یا پالا ان کو بالکل ختم کر دیتا ہے یا پھران کو اتنا نقصان پہنچا دیتا ہے کہ تندرست ہوتے ہوتے کئی سال لگ جاتے ہیں۔

اترپردیش میں بیج بوکر سال اگانے کا طریقہ بہت عام ہے۔ اس ریاست میں سال اگانے کے لیے سارا دار و مدار قدرتی وسائل پر ہوتا ہے۔ یہاں فطرت کے اصولوں کے مطابق کام کیا جاتا ہے اور اس سے اپنی مرضی کا کام لیتے ہیں۔ جب جنگلات سے سال کے درخت کاٹے جاتے ہیں تو ہر ہیکٹیئر میں چند توانا درخت چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ بعد میں ان ہی درختوں سے اگلی پود ملتی ہے کیونکہ مستقبل کا شجرزار ان ہی کے بیجوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اگر آگ لگنے سے چھوٹے پودے جل جائیں تو آئندہ فصل کے لیے بھی یہ درخت کام میں آتے ہیں۔ اس طرح یہ درخت آگ کے خلاف ایک طرح سے بیمہ کا کام کرتے ہیں۔ ان سے ایک دوسرا مقصد بھی پورا ہوتا ہے۔ سال کے پودے پالے کو برداشت نہیں کر پاتے۔ یہ درخت نئی فصل کے پودوں کو پالے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ چھوٹے پودوں کی فصل کو تیار ہونے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ جب نئے پودے ایک خاص عمر کو پہنچ جاتے ہیں تو پرانے درختوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے ان کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ نئے شجرزار کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے آگ، گھاس پھوس یا جانوروں سے محفوظ رکھا جائے۔

مغربی بنگال میں پرانے جنگلات کو کاٹ کر جگہ صاف کرلی جاتی ہے اور نئے جنگلات لگائے جاتے ہیں۔

سال کی لکڑی نہایت مضبوط، سخت اور پائیدار ہوتی ہے۔ یہ پائیدار اور مشکل کاموں کے لیے نہایت موزوں ہوتی ہے۔ اس سے ریلوے کے سلیپر، کھمبے، شہتیر اور ستون تیار کیے جاتے ہیں۔ کسان اس کی لکڑی سے اپنی گاڑیوں کے پہیے کا گھیرا، درمیانی تانتہ، دھرا اور اس کا ڈھانچہ بناتے ہیں جو عرصہ دراز تک سڑکوں اور راستوں کے ناموافق حالات کا بخوبی مقابلہ کرتے ہیں۔

ہندوستانی کرسمس درخت

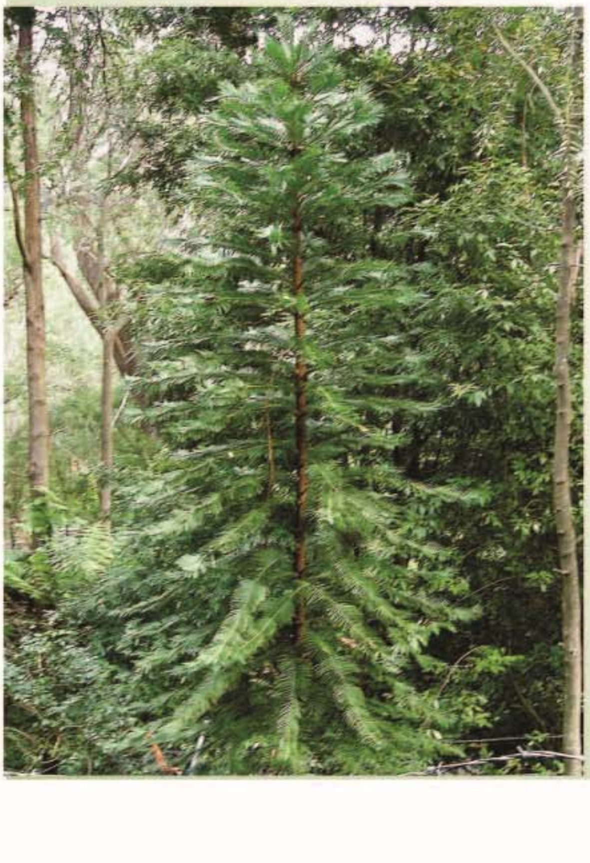

بڑے دن کے موقعے پر ایک چھوٹا سا درخت کمرے میں سجایا جاتا ہے جس کو کرسمس درخت کہتے ہیں۔ علاقے کے مطابق، غیرممالک میں کرسمس درخت سرو، صنوبر، چیڑ یا دیودار ہوسکتا ہے۔

گویا ان ممالک میں موقعہ محل کے اعتبار سے جو درخت بھی وہاں پیدا ہوتے ہوں، ان کو کرسمس پیڑ کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں ہمالیہ کے جنوب میں جہاں مخروطی پتوں والے درخت عام نہیں ہیں اکثر کیسورینا (Casurina) سے یہ کام لیا جاتا ہے۔

اپنی مخروطی پتیوں کے جھنڈ کے باعث یہ درخت بالکل کرسمس پیڑ کی طرح اُگتا ہے۔

سمندر کے طویل ریتیلے کناروں پر ان صنوبری درختوں کے اگنے سے وہاں کی قدرتی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ درخت ہمارے ساحلی علاقوں کے حسین ودلکش مناظر کا ایک حصہ ہیں۔ یہ شجرزار کافی صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ان کے نیچے کسی قسم کی گھاس یا جھاڑیاں نہیں اُگتیں۔ ساری زمین ان درختوں سے گری ہوئی سوئیوں کی مانند باریک باریک اور چھوٹی چھوٹی ڈنڈیوں سے ڈھکی رہتی ہے۔ یہ جگہ پکنک کے لیے نہایت موزوں ہوتی ہے۔

لیکن ان چیونٹیوں سے ہمیشہ ہوشیار رہیے جو اپنے کھانے کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں اور ان درختوں کے بیج بہت شوق سے کھاتی ہیں۔

کیسورینا(Casurina) کا پیڑ بالکل سیدھا اور لمبا ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کو وقتاً فوقتاً تراشا نہ جائے تو یہ جھاڑ دار پودے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ کیسورینا کی باڑھ لگانا ایک عام بات ہے۔ باغوں میں ان کو چڑیوں اور جانوروں کی شکل دے کر تراش دیا جاتا ہے۔ یہ ہنرمند باغبانوں کا ایک کمال ہوتا ہے۔ جھاڑیوں کی تراش خراش کے فن کو خوش تراشی کہتے ہیں۔

سمندر کے ساحلوں اور دریاؤں کے ایسے کناروں پر جہاں درخت نہیں اُگتے، ریت متواتر اڑتی رہتی ہے۔ اس لیے ایسے مقامات پر ریت کے چھوٹے چھوٹے تودے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی تودہ لمبے عرصے تک برقرار نہیں رہ پاتا۔ پرانے زمانے میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ مندر اور گاؤں ریت کے نیچے دب گئے کیونکہ ہوا سے مقابلہ کرنے کے لیے وہاں درخت نہیں تھے اور ریت مسلسل اڑتی رہتی تھی۔

کیسورینا کے شجرزار ایسی جگہوں پر ریت کو اڑنے سے بچانے کے لیے بے حد موثر ثابت ہوئے ہیں۔ کیسورینا کا پودا انڈمان اور برما کے ساحل سے لایا گیا تھا۔ جہاں وہ خودبخود اُگتا ہے۔ آج سے سو سال پہلے اس درخت کا پہلا جنگل جنوبی کنارا میں اُلال (Ullal) کے قریب لگایا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ جزیرہ نما ہندوستان کے ساحلوں پر اور خاص کر مشرقی ساحل پر پھیلتا چلا گیا۔ بعض موزوں مقامات پر یہ 30 میٹر یا اس سے بھی زیادہ اونچا اگ جاتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً پچاس سال ہوتی ہے۔ اس کے شجرزار ہموار ساحلوں، ریت کے تودوں اور دریاؤں کے کناروں پر لگائے جاتے ہیں۔ اس طرح کے جنگلات لگانا کافی سودمند ثابت ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کو غیرموزوں زمین پر بھی اگا لیتے ہیں۔ ایسے شجرزار اگانے کے لیے پہلے نرسری میں تیار کیے ہوئے 30 سے 50 سینٹی میٹر لمبے پودے لگائے جاتے ہیں۔ پودے لگانے کا کام بارش کے بعد شروع کیا جاتا ہے۔ جب پودے لگائے جاتے ہیں، اس دن کام کرنے والے تمام لوگ بے حد مصروف ہوتے ہیں۔ مزدوروں کا ایک گروہ دو سے تین میٹر کے فاصلے پر گڑھے کھودتا

ہے اور دوسرا گروہ ساتھ ساتھ ان گڑھوں میں پودے لگاتا چلا جاتا ہے۔ بہت سی عورتیں قطار بنا کر پانی کے برتن لیے موجود رہتی ہیں اور پودے لگانے میں ان کی مدد کرتی ہیں۔ گڑھوں میں پانی ڈال دیا جاتا ہے اور مٹی کو خوب ملا کر اس کو پتلا گارا جیسا بنا دیا جاتا ہے۔ اس عمل کو پڈلنگ (Puddling) کہتے ہیں۔ گڑھوں میں صرف پودے لگا دیے جاتے ہیں اس کے بعد ان میں نئی مٹی بھر دی جاتی ہے اور اس مٹی کو اوپر سے اچھی طرح دبا دیا جاتا ہے۔ ریتلی مٹی میں پانی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر پاتا اس لیے جب تک ان پودوں کی جڑیں کافی نیچے تک نہ پہنچ جائیں، ان میں چند ہفتوں تک خوب پانی دیا جاتا ہے۔

کیسورینا (Casurina) کے درخت میں ایک بات بہت عجیب و غریب ہوتی ہے وہ یہ کہ اس کی جڑوں کے اوپر سرسوں کے برابر چھوٹے چھوٹے ابھار ہوتے ہیں جن کو ہم گانٹھیں کہہ سکتے ہیں۔ ان گانٹھوں میں ایک قسم کا کیڑا رہتا ہے۔ یہ کیڑے ایک پراسرار دوستی کے ذریعے پودوں کی خوراک حاصل کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ خوراک ان پودوں کو زمین کے نیچے سے نہیں مل پاتی۔

اس درخت کے شجر زار تامل ناڈو، کرناٹک، آندھرا پردیش اور اڑیسہ میں لگائے گئے ہیں۔ جب وہ آٹھ دس سال اور کبھی کبھی پندرہ سال کے ہو جاتے ہیں۔ تو ان کو کاٹ لیا جاتا ہے۔ کیسورینا کی لکڑی ایندھن کے کام آتی ہے اور جلنے والی لکڑیوں میں سب سے بہتر مانی جاتی ہے۔

■

ماخذ: جنگلات کی کاشت (انسان ساختہ جنگلات)،
مصنف: ایس کونداس، مترجم: مسرت جہاں،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پرندہ

اپنا گھر خود ہی میں بناتا ہوں
ایک چھوٹا سا میں پرندہ ہوں
پربتوں کی میں سیر کرتا ہوں
اُن نظاروں کا لطف لیتا ہوں
روک سکتی نہیں ہوائیں بھی
میں پروں میں کمال رکھتا ہوں
مجھ کو ہر پیڑ سے محبت ہے
پھول پتوں سے دل لگاتا ہوں
اپنے بچوں کو پالنے کے لیے
دانہ دانہ میں ڈھونڈ لاتا ہوں
گیت گاتا ہوں میں محبت کے
گنگناتا ہوں چہچہاتا ہوں
دوست میرا بشیر احمد ہے
اس سے مل کر خوشی مناتا ہوں

■

Syed Bashir Ahmed Bashir
Block No.:5, Jai-Hind Nager
Bigapur Road
Solapur - 413004 (Maharashtra)

انصاری اسما سلیم

سیلفی اور اس کے نقصانات

موجودہ دور میں سب سے زیادہ کس چیز کا رواج ہے؟ اس سوال کا جواب بچہ بچہ جانتا ہے۔ جی ہاں! سیلفی! سیلفی!

یہ وہ لت ہے جو اس وقت بلاتفریق مذہب و رنگ و نسل دنیا بھر کے لوگوں کو لگ چکی ہے جسے دیکھو وہ منہ کے طرح طرح کے زاویے بناتے ہوئے موبائل ہاتھ میں لے کر اپنی تصویریں کھینچتا نظر آ رہا ہے۔ ہر کوئی سیلفی کھینچ کر فیس بک، واٹس اَپ پر چپکانے پر تلا ہوا ہے۔ کوئی نئے کپڑوں میں تو کوئی بیوی بچوں کے ساتھ، کسی کو چلتی ٹرین کے آگے سیلفی کا شوق چڑھا تو کوئی پہاڑوں پر چڑھ کر سیلفی لے رہا ہے۔ کوئی ندی، تالاب اور سمندر کے کنارے لہروں کے ساتھ سیلفی کھینچ رہا ہے تو کوئی جانوروں کے ساتھ۔

آج نوجوان، بچے، بزرگ حتیٰ کہ خواتین میں بھی سیلفی کا نشہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ آج کل خواتین ”صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔“ کے مصداق چہرے پر نقاب لیے سیلفی لے رہی ہیں تو کوئی محترمہ چہرے پر گھنی زلفوں کا جال لیے سیلفی لے رہی ہیں۔

تو آیئے! دوستو، جانتے ہیں کہ دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں

لینے والی اس سیلفی کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی؟ اور سب سے پہلی سیلفی کس نے کھینچی؟

سیلفی کا مطلب ہے اپنی تصویر خود کھینچنا اور انگریزی میں Self Publicity یعنی خود کی تشہیر کرنا۔ اپنی تصویر خود بنانے کا یہ عمل کس وقت شروع ہوا جب امریکن فوٹو گرافر روبرٹ کورنیلیس نے 1839 میں اپنی تصویر خود بنائی۔ روبرٹ کورنیلیس Robert Cornelius ایک پیشہ ور فوٹو گرافر تھا۔ اس نے کافی کوششوں کے بعد چاندی کے ورق جیسی کسی چمکتی ہوئی چیز یا شیٹ میں اپنا عکس دیکھ کر خود کی تصویر کھینچی جو daguerreotype کہلاتا ہے۔ اس پروسیس کی ایجاد کا سہرا ویسے فرانسیسی مصور اور فوٹو گرافر لوئیس ڈاگیوری (Lois Daguerre) کے سر جاتا ہے۔ اس کے بعد 1900 میں کوڈک Kodak کے Browniebox camera بازار میں آیا جس میں شیشے کی مدد سے تصویریں کھینچی جانے لگی۔ پھر 1914 میں روس کی 13 سالہ نکولوینا Anastasia Nikolaevna نے شیشہ کی مدد سے سیلفی کھینچی۔ اس کے بعد اٹلی کے میڈیا آرٹسٹ ابرٹو فریگیو کا نام اس فہرست میں درج ہوا۔

لفظ سیلفی Selfie کی اصطلاح سب سے پہلے آسٹریلین انٹرنیٹ فورم نے 13 ستمبر 2002 میں استعمال کی۔

2003 کی دہائی میں جاپان کی مشہور موبائل کمپنی سونی اریکسن نے موبائل کے ماڈل Z1010 میں فرنٹ کیمرہ نصب کیا جس سے تصویر بنانے کے ساتھ ساتھ ویڈیو کال سے بھی لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔ فیس بک، ٹویٹر کے آنے سے پہلے سول میڈیا کی ویب سائٹس My Space سیلفیوں کا محور بنی رہی۔ 2006 اور 2009 میں فیس بک، ٹویٹر کے نمودار ہونے سے سیلفیوں میں حیرت انگیز اضافہ دیکھنے کو ملا۔ آج کل سیلفیاں بنانے کا رواج خاص و عام ہر ایک میں یکساں پایا جا رہا ہے۔

چاہے کوئی عام آدمی ہو یا مشہور و معروف شخصیت، اعلیٰ عہدیدار ہو، فلمی شخصیات ہوں یا سیاسی شخصیات حتیٰ کہ کئی ممالک کے وزیر اعظم اور صدور بھی سیلفی کا لطف اٹھا چکے ہیں۔

سیلفیوں کی بدولت کسی کی عزت، شہرت پروان چڑھ رہی ہے اور اسی سیلفی کی وجہ سے عزت کی نیلامی بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور بعض اوقات سیلفیوں کا جنون موت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ آئے روز سیکڑوں واقعات و حادثات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

آیئے دوستو! اب اک نظر ڈالتے ہیں سیلفی سے ہونے والے نقصانات پر۔

* گذشتہ دنوں لندن میں ہونے والی فیس، فیشل ایلیستھک کانفرنس میں یہ بات سامنے آئی کہ سیلفی لینے کی عادت نوجوانی میں جھریاں پڑنے کا سبب بن سکتی ہے۔ طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ چہرے کو اکثر اسمارٹ فون سے خارج ہونے والی روشنی اور الیکٹرو میگنیٹک شعاعوں کی زد میں رکھنا جلد کو نقصان پہنچاتا ہے اور بڑھاپے کی جانب سفر تیز ہو جاتا ہے اور جھریاں ابھر آتی ہیں۔
* بہت زیادہ سیلفی لینا لوگوں میں نفسیاتی بیماریوں کا باعث بن رہا ہے۔
* ڈاکٹرز کے مطابق سیلفی کے سبب لوگ خود تک ہی محدود ہو رہے ہیں اور خود کو خوبصورت دکھانے کی تمنا آپ کو ہر وقت ایک غیر حقیقی دنیا میں رکھتی ہے۔ جو کام کرنے کی صلاحیت اور سیکھنے کی صلاحیت پر برا اثر ڈال سکتی ہے۔
* فیس بک اور سوشل میڈیا پر اپنی سیلفی کی ناپسندیدگی نوجوانوں کو شدید قسم کے ڈپریشن میں مبتلا کر دیتی ہے اور یہ عادت نوجوانوں کی پوری شخصیت پر اثر ڈالتی ہے اور یہ کسی بھی فیلڈ میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔

* ماہرین کے مطابق بدترین قسم کا ڈپریشن، کھانے کی عادات میں بے ترتیبی اور دماغی کمزوری کا تعلق بھی سیلفی سے ہی ہے۔
* ڈاکٹر (ایمسن) کے مطابق بہت زیادہ سیلفی لیتے رہنا آپ کو بیرونی دنیا سے کاٹ کر خود پرست اور انا پرست بنا سکتا ہے۔
* ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ جب کوئی شخص سیدھا یا الٹا ہاتھ فون تھامنے کے لیے استعمال کرتا ہے تو چہرے کو اسی جانب کی جلد کو نقصان پہنچنا شروع ہو جاتا ہے۔

اگر سیلفی کی لت پر وقت رہتے کنٹرول نہیں کیا گیا تو یہ عادت لوگوں کو بدترین قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں جکڑ سکتی ہے۔

دنیا بھر میں سیلفی کے شوقین اس شوق کے ہاتھوں اپنی جان بھی گنوا دیتے ہیں۔ سیلفی کے ذریعے ہوئی اموات کے کچھ اعداد و شمار:

سب سے پہلی سیلفی سے موت 15 اکتوبر 2011 کو امریکہ میں ہوئی جب تین دوستوں نے چلتی ٹرین کے سامنے سیلفی لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد انگلینڈ میں 13 دسمبر 2013 کو سیلفی سے ایک موت ہوئی جبکہ لبنان میں 27 دسمبر 2013 کو سیلفی کے چکر میں ایک نوجوان کی موت ہوگئی۔

سیلفی کی وجہ سے اسپین میں سب سے پہلا حادثہ جو درج ہوا وہ یہ تھا کہ اس شخص 15 مارچ 2014 کو سیلفی لیتے وقت بجلی کا جھٹکا لگنے سے موت کی نیند سو گیا جبکہ وہ ٹرین کی چھت پر کھڑے ہو کر سیلفی لے رہا تھا۔

ان حادثوں کے بعد تو پوری دنیا میں سیلفی اموات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بھارت میں مئی 2014 میں پہلی سیلفی لیتے ہوئے موت ہوئی تھی۔

2014 'سیلفیوں کا سال' Year of the Selfies کہلایا۔ جبکہ فلپائن کی Makati City اور Pasig Selfie capital of world کہلائے۔ Makati City میں پہلی

سیلفی موت درج ہوئی جب ایک 14 سالہ لڑکی سیلفی لیتے ہوئے تیسری منزل سے گری اور دوسری منزل پر آکر دم توڑ گئی۔

بھارت کو سیلفی کے باعث ہونے والی اموات میں انفرادیت حاصل ہے۔ 2015 میں بھارت Selfie death capital of world کہلایا اور یہ اب تک برقرار ہے۔

واشنگٹن پوسٹ کے مطابق دنیا میں اب تک ہوئی سیلفی اموات کی 50 فیصد اموات صرف بھارت میں واقع ہوئی ہیں۔

بھارت میں واقع ہوئی سیلفی اموات و حادثات:

(1) حال ہی میں تین نوجوان لڑکیاں بحر عرب میں گر گئیں جب وہ Banstand ممبئی میں سیلفی لے رہی تھیں۔ ان کو بچانے کے لیے ایک آدمی نے چھلانگ لگائی اور وہ بھی اپنی جان کھو بیٹھا۔

(2) جنوری 2015 میں تین نوجوان طالب علم اس وقت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جب انھوں نے تیز رفتار ٹرین کے ساتھ سیلفی لینے کی کوشش کی۔ یہ حادثہ واقع ہوا متھرا کے نزدیک کوسی کالا میں۔

(3) مارچ 2015 میں ناگپور میں سات نوجوانوں کی موت واقع ہوئی۔ وہ کشتی میں سوار سیلفی لینے کی کوشش کر رہے تھے کہ کشتی نہر میں اُلٹ گئی۔

(4) ستمبر 2015 میں ایک جاپانی سیاح تاج محل کی سیڑھیوں سے گر کر مر گیا۔ وہ بھی سیلفی لینے کے چکر میں سیڑھیوں سے پھسل گیا تھا۔

(5) تامل ناڈو میں ایک انجینئرنگ طالب علم کولی پہاڑوں پر سیلفی لے رہا تھا کہ چٹان کھسک گئی اور وہ 60 فٹ گہری کھائی میں گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

(6) گجرات میں دو نوجوان سیلفی لیتے ہوئے دریائے نرمدا میں گر گئے۔

(7) 2016 میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مارچ میں دو نوجوان بحر عرب میں گر کر جان کی بازی ہار گئے کہ جب وہ باندرہ ورلی سی لنک پر سیلفی لے رہے تھے۔

(8) 2017 میں بھی یہ اعداد و شمار بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ مارچ 2017 میں بھی ایک نوجوان باندرہ ورلی سی لنک پر سیلفی لیتے ہوئے بحر عرب کا لقمہ بنا۔

حالانکہ ممبئی پولس نے 16 مقامات پر No-selfie zone قائم کیا ہے۔ سیاحوں کے لیے پُرکشش مقامات گرگام چوپاٹی، میرین ڈرائیو اور Banstand کو بھی no-selfie zone میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ بدقسمتی سے سیلفی اموات و حادثات کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے ہیں بلکہ یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ سیلفی لیتے وقت ہم کتنی لاپروائی اور غیر محتاط انداز اختیار کرتے ہیں۔

سیلفی ضرور لیں لیکن کچھ احتیاط سے، سیلفی لینے کے لیے سیلفی اسٹک کا استعمال کریں اور سیلفی لیتے وقت اپنی اہمیت، اپنی عزت کو جانچ لیں کہ کہیں یہ سیلفی آپ کی موت کا سودا تو نہیں بنے گی؟ یا یہ عمل آپ کی اور ہمارے معاشرے کی عزت کو نقصان تو نہیں پہنچائے گا؟...

■

Ansari Asma Bano Saleem Akhtar
H.No: 16, S.No: 374, Madina Park
Near Masjid Masood
Dhule - 424001 (Maharashtra)

■ شبیر اصغر

ٹافی انکل

منڈے کو ہم نٹ کھٹ بچے　　ونڈے کرکٹ کھیل رہے تھے
رنکو ڈبو سونا مونا　　دوڑ رہے تھے کونا کونا
بلا کیا ہم ہک کرتے تھے　　چھکے کی بارش کرتے تھے
خوشی میں ہم سب جھوم رہے تھے　　بال و بلا چوم رہے تھے
دیکھتا کیا ہوں چنچل چنچل　　ہم سب کا وہ ٹافی انکل
رو رو کر ہلکان ہوا ہے　　جانے کیوں بے جان ہوا ہے
شارق سی سونا مونا　　دیکھ کر ان کا رونا دھونا
بولے انکل کیا کرتے ہو　　میری جیت پہ کیوں روتے ہو
انکل بولے ڈبو جانی　　میرے بچپن کی ہے کہانی
کھیل رہے تھے ہم سب ونڈے　　ماں نے مارا ڈنڈے ڈنڈے
بولی میچ اور وہ بھی منڈے　　میچ تو ہے بس سنڈے سنڈے
سن کر ہم بچے ہنستے تھے　　ٹافی انکل بس روتے تھے
انکل روتے روتے بولے　　پیارے بچو! تم ہنستے ہو
آج جو بچے دن کھوئیں گے　　کل انکل جیسا روئیں گے

■

Shabeer Asghar
481/1 G.t Road, P.O: Shibpur
Distt.: Howrah -711102 (West Bengal)

راحت حسن

میری سائیکل

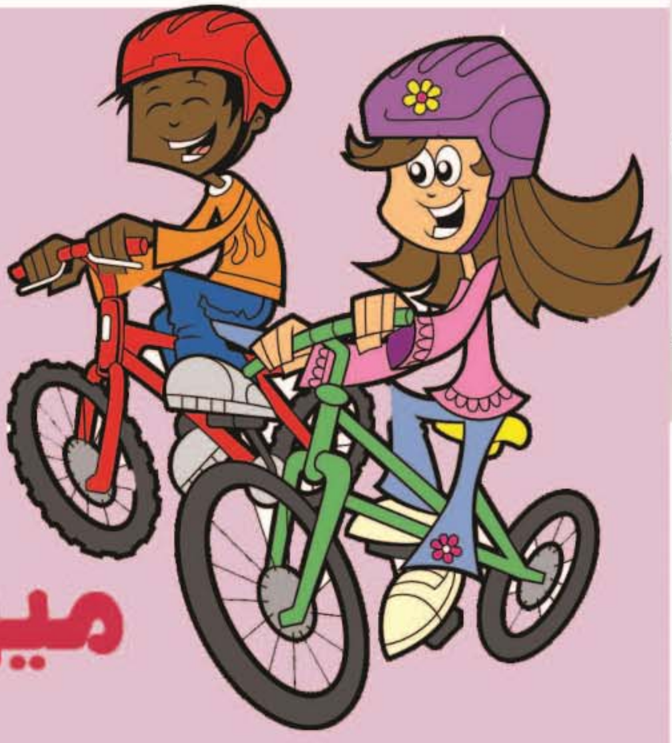

یوں تو ہے بے روح اور بے جان میری سائیکل
پھر بھی رکھتی ہے نرالی شان میری سائیکل

مال کی بھوکی نہیں، خالی ہوا کھاتی ہے یہ
جس طرف چاہوں، بنا پٹرول لے جاتی ہے یہ

کار ہو، موٹر کہ بس، یہ ہے سبھی سے بے نیاز
راستہ لے لیتا ہے اس کی مدھر گھنٹی کا ساز

چاہے جتنی بھیڑ ہو، یہ جام میں پھنستی نہیں
ہے سواری کوئی بھی اس کی طرح سستی نہیں

یہ نہیں مانوس بہتے پانیوں کی دھار سے
راہ پر چلتی ہے یہ بس بیچ کی رفتار سے

کیا امیر اور کیا غریب اور کیا برے کیا نیک ہیں
یہ وہ اندھی نار ہے جس کے لیے سب ایک ہیں

کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے، کس قدر سادی ہے یہ
اپنی ہی رفتار سے چلنے کی بس عادی ہے یہ

چست و تندرست رکھے، یہ بھی اس کا کمال
ہے سواروں کی یہاں صحت کا بھی اس کو خیال

پیار کی قائل ہے یہ، جاتی نہیں یہ ذات پر
فرق یہ کرتی نہیں دین و دھرم کی بات پر

راہ کرتی ہر کوئی آسان میری سائیکل
کاش اپنائے ہر اک انسان میری سائیکل

■

Rahat Hasan
Prem Nishan, Doodhpur
Aligarh - 202002 (UP)

حجاب امتیاز علی

ویسے تو ہر سال میری سال گرہ کی تاریخ سردیوں میں آیا کرتی تھی پر اس سال میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اپنی سال گرہ گرمی میں مناؤں گی، اس لیے نہیں کہ گرمیوں میں کوئل کوکتی ہے یا باغوں میں موتیا کے پھول کھلتے ہیں، یا پکے پکے رسیلے آم کھانے کو ملتے ہیں — جی نہیں — وجہ صرف یہ تھی کہ گرمیوں میں سال گرہ منانے میں مجھے ایک بہت بڑا فائدہ نظر آتا تھا، وہ یہ کہ اس موسم میں ہم سب اکٹھے ہوتے تھے۔ ریحانی بھیا! اپنے کالج سے، اور جسوتی چچا کے ہاں سے اور میں اپنے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس سے دادی زبیدہ کے پاس شہر کیسباس کے ساحلوں پر تعطیلات منانے آجاتے تھے، اندھا کیا چاہے؟ — دو انکھیاں۔ میں نے اس یکجائی کو غنیمت سمجھا اور دل میں ٹھان لی کہ سال گرہ فوراً ہی منا ڈالنی چاہیے، ڈر تھا تو بھیا ریحانی کا۔ کیونکہ وہ میرے ہمیشہ کے دشمن تھے اور میرے منصوبوں کی عمارت کو دھڑام سے زمین پر گرانے میں انھیں بڑا مزہ آتا تھا۔ ادھر جسوتی سے بھی اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بچی بات دادی زبیدہ سے نہ جا کر لگا دے۔ پھر بھی میں تھی بڑی ڈھیٹ اور ارادے کی پکی!

دوسرے دن صبح صبح ناشتے کی میز پر حلوا کھاتے کھاتے میں نے نہایت دلیری سے سوال کیا ”تو دادی جان پیاری، آپ مجھے کیا تحفہ عنایت فرمائیں گی؟ وہ — وہ میری سال گرہ سر پر آ گئی ہے۔“ جملہ ختم کرتے ہی ڈر کے مارے کھانسنے اور بھیا ریحانی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔

دادی زبیدہ نے میری بات سرے سے سنی ہی نہیں۔ جانے کس نے انھیں یہ بری عادت سکھا دی تھی کہ وہ صبح ناشتے کے دوران اخبار پڑھنے بیٹھ جاتی تھیں اور ایک دفعہ تو اسی بری عادت کی بدولت اخبار پڑھتے پڑھتے بے خیالی میں گندہ انڈا بھی مزے سے کھا چکی تھیں۔ بعد میں انھیں ابکائیاں بھی آئی تھیں۔

چنانچہ اس وقت بھی وہ اخبار میں قتل و خون۔ ڈاکہ چوری اور زلزلے کی دہشت ناک خبریں پڑھ رہی تھیں اور مارے خوف کے لرز رہی تھیں۔ مری بات ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکی تھی۔

بھیا ریحانی جو آم کے مربے کا مرتبان بڑے زور سے اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ میری بات سن کر رک گئے اور

میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگے ”ارے کیا کہا روحی تم نے؟ سال گرہ؟ کس کی سالگرہ اور کیسی سال گرہ؟“

بھیا ریحانی کو میری قلعی کھولنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اس لیے میرے ہوش اڑ گئے کہ کہیں پکڑی نہ جاؤں۔ میں نے دل میں سوچا کہ پہلے دادی زبیدہ کی خوشنودی حاصل کر لینی چاہیے، پھر اپنی سال گرہ کا اعلان کرنا چاہیے۔ میں دادی جان کی طبیعت سے خوب واقف تھی کہ انھیں کن باتوں سے خوش کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے میں نے نہایت ادب سے کہا ”دادی جان پیاری۔ وہ آپ کی زکام کی گولیاں — اوپر کی منزل میں رہ گئی ہیں۔ لے آؤں؟ نوش فرمایئے گا؟“

جسوتی کیلا کھاتے کھاتے بولی ”وہ تو دادی جان بہت سویرے کھا لیتی ہیں۔“

میں سوچ سوچ کر بولی ”تو پھر آپ کا مفلر لے آؤں دادی جان۔ پنکھے کی ہوا سے کہیں آپ کو چھینک نہ آجائے۔“

بھیا ریحانی آملیٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا کانٹے کے ذریعے مونہہ میں ٹھونستے ہوئے بولے ”اس گرمی میں پنکھے کی ہوا سے دادی جان کو چھینک آئے گی، عقل ماری گئی ہے تمھاری؟“

جسوتی ہنس کر بولی ”آج روحی کو دادی جان کی صحت کی فکر بہت ستا رہی ہے، بات کیا ہے؟ بھئیا راہے نمازی تو ضرور ہے۔ دغا بازی۔ ہی ہی ہی ہی — “ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں ڈر کر دادی زبیدہ کو دیکھنے لگی مگر شکر ہے وہ اخبار کی وحشت ناک خبروں میں غرق تھیں۔

بھیا ریحانی بولے ”میں خوب جانتا ہوں جو روحی کا مطلب ہے۔ ہاں — !“ انھوں نے ’ہاں‘ کہہ کر زور سے نمک دانی میز پر ماری تو میز ہل گئی۔

میز کے ہلتے ہی دادی زبیدہ اخبار پھینک کر مارے خوف کے اٹھ کھڑی ہوئیں ”بھاگو بھاگو۔ ارے باہر بھاگو۔ زلزلہ آگیا۔ ابھی ابھی میں سیام کے زلزلے کی خبر پڑھ رہی تھی۔“

بھیا ریحانی فوراً کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تعظیماً جھک کر بولے ”میں معافی چاہتا ہوں دادی جان۔ وہ زلزلہ نہیں تھا۔ میں نے نمک دانی ذرا میز پر رکھی تھی۔“

دادی زبیدہ ہماری بدتمیزیوں کو کبھی بخش نہ سکتی تھیں اس لیے ناراض ہو کر بولیں ”کچھ تو کھانے کی میز کے آداب سیکھو ریحانی، یہ طور طریق ہوتے ہیں تہذیب یافتہ گھرانوں کے؟ نہ جانے تم لوگوں کا کیا حشر ہوگا؟“

میں دادی جان پر اپنی تمیز داری کا سکہ بٹھانا چاہتی تھی، اس لیے جھک کر فوراً بکھرے ہوئے اخبار کے صفحے سمیٹنے لگی، پھر دادی زبیدہ کے آگے پیش کر کے بولی۔ ”لیجیے دادی جان اخبار کے صفحے، ریحانی بھیا کے میز پر زور سے نمک دانی رکھنے سے بکھر گئے تھے۔“

”کیا خاک پڑھوں اب اخبار؟ ویسے ہی میں صبح کے وقت وحشت ناک خبریں پڑھ کر دہشت زدہ رہتی ہوں۔ اب میز کے ہلنے سے میرا دل ہل گیا۔ اس کا اثر براہِ راست میرے ہاضمے پر پڑا۔ چنانچہ بھوک بند ہو چکی ہے۔“

میں موقع کی تاک ہی میں تھی بولی ”واقعی ریحانی نے نمک دانی بے حد زور سے میز پر رکھی۔ آپ کے لیے بادام کا حلوا پراٹھے پر لگا دوں دادی جان پیاری؟ شاید اس سے بھوک کھلے۔“

”نہیں — اب کیا خاک کھلے گی بھوک۔“ وہ ہم سب سے چڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے دوبارہ اخبار اٹھا لیا تھا۔

”کہیے تو تو اسٹرابری جام بسکٹ پر لگا دوں آپ کے لیے؟“ میں نے دوبارہ خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

”تم دراصل چونا لگانا چاہتی ہو ہم سب کو۔ جام بسکٹ پر

نہیں۔ میں خوب جانتا ہوں تم کو۔ ہاں—" ریحانی نے قہر بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا لیکن اس دفعہ انھوں نے 'ہاں' کر کے ہاتھ میز کی بجائے اپنے زانو پر مار لیا۔

"روحی بیٹی!" دادی جان نے اخبار کے پیچھے سے کہا "چاہو تو میرے لیے ایک سیب کاٹ دو شاید اس سے مری بھوک کھلے۔"

میں خوش ہوگئی "جی بہت اچھا۔" میں نے جلدی جلدی سیب کاٹتے ہوئے کہا "یہ لیجیے چھل گیا سیب۔ یہ رہا اس کا ٹکڑا—

آپ کو زحمت تو ہوگی، مگر ذرا مونہہ کھولیے تو ایک ننھا سا ٹکڑا اندر ڈال دوں— ہاں تو— دادی جان۔ میں پوچھ رہی تھی آپ مجھے کیا تحفہ دیں گی؟ وہ مری سال گرہ سر پر آگئی۔"

دادی جان پھر اخبار میں غرق، شاید کسی کے قتل کی خبر پڑھ رہی تھیں اس لیے انھوں نے سنا نہیں مگر بھیا ریحانی نے ایک زہریلی نظر مجھ پر ڈالی اور پوچھا "کس کی سال گرہ؟ اور کیسی سال گرہ روحی؟" میں نے بات بنائی "تم بھی ایک افیونی ہو ریحانی بھیا، پرسوں میری سال گرہ ہے، بھول گئے کیا؟"

"جھوٹ اور سفید جھوٹ۔" ریحانی غصے سے بولے "تمھاری سال گرہ تو سردیوں میں آتی ہے۔" اس پر جسوتی زور سے کہنے لگی "اور کیا روحی کو تو آج تک گھر پر سال گرہ منانی کبھی نصیب ہی نہ ہوئی یاد نہیں، ہم مبارک باد کا تار اس کے بورڈنگ ہاؤس کے پتے پر بھیجا کرتے تھے؟"

میں ان لوگوں کی مخالفت پر دل ہی دل میں لرز رہی تھی مگر ہمت ہارنے والی میں بھی نہیں تھی، اپنی بات پر اڑی رہی اور گلا صاف کر کے نہایت متحیر انداز سے کہا "تم لوگوں کے حافظے کم زور ہیں، وہ سردیوں کی نہیں، گرمیوں کی بات ہے۔"

ریحانی کا غصہ بڑھتا جاتا تھا "برساتوں کی؟ یا جاڑوں کی۔ بات تمھاری سال گرہ کی ہے، میں تمھارے ہی سر کی قسم کھاتا ہوں۔ روحی تمھاری سال گرہ سردیوں میں آتی ہے، اور بیچ سردیوں میں آتی ہے۔"

"خدا کے لیے میرے سر کی قسم تو نہ کھاؤ ریحانی۔" میں نے ڈر کر کہا "مجھے وہم آتا ہے۔" میں رونے کے قریب ہوگئی۔

اس پر بھیا ریحانی جوش میں آگئے "کیوں نہ کھاؤں تمھارے سر کی قسم؟ کھاؤں گا اور ضرور کھاؤں گا۔ ہاں—" انھوں نے حسب عادت زور سے 'ہاں' کہہ کر میز پر ہاتھ مارا تو اب کے دودھ دان لڑھک گیا اور بالائی کی ایک دھاری میز

کے نیچے ٹپ ٹپ گرنے لگی۔

اب دادی زبیدہ اخبار تہہ کر کے ہماری طرف متوجہ ہوگئیں ''ستم ستم! یہ کیا دھینگا مشتی ہے؟ کچھ تو تہذیب سیکھو۔ یہ عادتیں ہوتی ہیں اعلیٰ خاندانوں کے بچوں کی! — ارے یہ آملیٹ کا ٹکڑا مربے میں کیسے جا گرا؟ یہ دودھ دان کیسے لڑھک گیا؟ یہ بالائی فرش پر کیوں برسنے لگی؟ یہ قیامت کیسے آگئی آخر —؟''

بھیا ریحانی نے فریاد کی ''دادی جان، قیامت کیسے نہ آئے، روحی اپنی سال گرہ منانا چاہتی ہے۔''

''تو اسے منانے دو۔ تمھیں کیا اعتراض ہے؟''

جسوتی بولی ''ریحان کو اعتراض اس بات پر ہے کہ یہ دوبارہ اپنی سال گرہ منانا چاہتی ہے۔''

میں نے کہا ''دادی جان پیاری۔ آپ بتایئے میری سال گرہ سردیوں میں آتی ہے یا گرمیوں میں؟ — گرمیوں میں نا —؟''

اتفاقاً، بلکہ میری خوش قسمتی سے اس سال دادی زبیدہ بھولنے کے مرض میں بڑی شدت سے مبتلا تھیں۔ کئی حکیموں اور ڈاکٹروں نے علاج کیا — گولیاں دیں — معجون آزمائے — شربت پلائے۔ آملے کا مربہ عرق گاؤزباں میں گھول کر چٹایا۔ بادام گھس کر کھلائے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اب تو حالت یہ تھی ادھر بات سنی اور اُدھر بھول گئیں۔ اس پر ایسی ہٹ دھرمی — کہ جو خود کہیں گی وہی درست۔ دوسرا خواہ کتنا ہی سچ بولے، مگر وہ جھوٹا۔ چنانچہ فرمانے لگیں ''ہاں، ہاں روحی کی سال گرہ ہمیشہ گرمیوں میں آتی ہے۔''

بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ میں چہک کر بولی ''پرسوں میری سال گرہ ہے۔ آپ کیا تحفہ عنایت فرمائیں گی، دادی جان پیاری؟''

ایکا ایکی یوں تختہ اُلٹتا دیکھ کر بھیا ریحانی اور جسوتی جل کر رہ گئے۔ ریحانی کہنے لگے ''پھر تو میں بھی دوبارہ اپنی سال گرہ مناؤں گا۔'' ''ہاں'' کہہ کر انھوں نے حسبِ عادت میز پر زور سے ہاتھ مارا تو اِس دفعہ انڈے کا خول اڑ کر گل دان کے ایک پھول میں جا اٹکا۔ ''یہ حرکت کیوں کی تم نے۔'' دادی زبیدہ ناراض ہو کر کہا ''انڈے کا خول گل دان کے پھولوں میں! ایسی حالت میں تم اپنی سال گرہ دوبارہ منانا چاہتے ہو!''

میں ہنس پڑی، بولی ''دادی جان پیاری۔ بھلا سال گرہ بھی کوئی چیز ہے کہ انسان جب جی چاہے منانے لگے؟ پیدائشی تاریخ ہی ہے اور پیدا ہونا اپنی اختیاری بات نہیں۔ آپ کے لیے اتنا اس مربہ طشتری میں نکال دوں؟''

''نکال دو۔'' انھوں نے بے پروائی سے کہا۔

''یہ لیجیے۔'' میں پیش کرتے ہوئے پھر بولی ''ہاں فرمایئے۔ آپ مجھے کیا تحفہ دیں گی؟''

وہ اتفاقاً اس صبح مجھ سے خوش تھیں کہنے لگیں ''اتفاق کی بات ہے روحی، تمھارے لیے میرے پاس ایک نادر تحفہ کہیں سے آگیا ہے۔ وہی دے دوں گی اسے دیکھ کر تم باغ باغ ہو جاؤ گی۔''

مارے خوشی کے میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا، بے تاب ہو کر بولی ''کیا چیز ہے دادی جان؟''

''ابھی نہیں بتاؤں گی'' انھوں نے کانٹے کی نوک تلی ہوئی مچھلی کی دم پر رکھ کر فرمایا۔

ریحانی بے اختیار ہو کر بولے ''کم از کم اتنا ہی بتا دیجیے کہ اس کی لمبائی اور چوڑائی کتنی ہے؟''

''ہرگز نہیں۔۔'' انھوں نے مچھلی کے قتلے پر لیموں، نچوڑتے ہوئے کہا۔

جسوتی بولی ''وہ چیز کن حرفوں سے شروع ہوتی ہے دادی؟...... یا غ سے؟''

''نہ عین سے نہ غین سے۔ نہ شین سے نہ گاف سے۔''

دادی جان کو غصہ آنے لگا تھا۔

ریحانی اپنا کان قریب لا کر بولے ''میرے کان میں کہہ دیجیے۔ میں ان لڑکیوں سے نہیں کہوں گا دادی اماں۔''

دادی زبیدہ پیچ و تاب کھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں ''سال گرہ کے دن تک اس کے متعلق ایک لفظ نہ پوچھنا۔ خبردار۔''

''تو ہائے ہائے۔ یہ دن کیسے کٹیں گے! ہم لوگ تو سوچتے سوچتے بیمار پڑ جائیں گے۔ اس کا رنگ ہی بتا دیجیے۔'' ریحانی نے کہا۔

''اور اس کی لمبائی چوڑائی۔۔'' جسوتی نے التجا کی۔

دادی زبیدہ نفرت کے لہجے میں بولیں 'زبان سے بات نکلی نہیں اور تم لوگوں کو اس کی ٹوہ شروع ہوگئی۔ اچھا بابا سنو، اس کا رنگ سفید ہے۔ اونچائی چھ انچ اور لمبائی پون فٹ ہے۔ ہاتھ لگانے سے کہیں گرم گرم کہیں ٹھنڈی ٹھنڈی محسوس ہوتی ہے۔ کہیں روئی کے گالے کی طرح نرم ہے، کہیں پتھر کی طرح سخت۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ ہے کیا چیز۔۔! تو کان کھول کر سن لو، یہ بات سال گرہ کی شام تک ہرگز ہرگز نہیں بتائی جائے گی۔ تم لوگوں میں صبر بھی ہونا چاہیے۔''۔۔ یہ کہہ کر انھوں نے چھٹ سے باغ کا دروازہ کھولا اور فوارے کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ لیکن ہمارے دلوں میں اشتیاق کی آگ اور زیادہ بھڑکا گئیں۔

خدا خدا کر کے سال گرہ کی شام آئی۔

دل دھک دھک کر رہے تھے۔ پائیں باغ میں تختۂ گلاب کے قریب چائے کی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ فوارے چل رہے تھے۔ نیلے پیلے، سرخ، سبز پھول بیلوں ٹہنیوں پر لٹک رہے تھے۔ میری اور جسوتی کی ساری سہیلیاں اور ریحانی کے کئی دوست آئے ہوئے تھے۔ تحفہ کی اسراریت کے متعلق ان سب نے سن رکھا تھا کہ اس دفعہ دادی جان مجھے ایک عجوبہ تحفہ دینے والی ہیں۔ میں اپنی سال گرہ کا زرق برق گلابی جوڑا پہنے خوش خوش اپنی سہیلیوں میں ایک خاص ادا سے چل پھر رہی تھی۔ جسوتی بھی چمک دار جوڑے میں کھلکھلا رہی تھی، پر نہ جانے کیا بات تھی بھیا ریحانی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ دوپہر ہی سے کچھ سہمے سہمے سے محسوس ہو رہے تھے۔

چائے کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ بچوں نے دادی جان کی جان کھانی شروع کر دی کہ خدا کے لیے اب وہ عجیب و غریب چیز ہم سب کو دکھا دیجیے۔ یہ سن کر دادی جان مسکرا کر اٹھیں اور سارے مہمان بچوں کے سامنے بڑے فخر سے اپنی خادمہ سے کہنے لگیں ''صنوبر! اٹھا لانا وہ تحفہ، لیکن دیکھ! بڑے احتیاط سے۔'' یہ سننا تھا کہ صنوبر بالا خانے کی لمبی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہم سب زینے کے نیچے کھڑے بے تابی سے منتظر تھے۔ یکایک ہمارے دیکھتے دیکھتے بالا خانے کی پہلی سیڑھی پر صنوبر سر پر ایک بہت بڑا سا ٹوکرا رکھے نمودار ہوئی۔

ہم سب تالیاں بجانے لگے، اور وہ زینے زینے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔

''وہ رہا تحفہ۔''

''وہ آیا تحفہ۔''

''دادی جان کا نایاب تحفہ۔''

غرض جتنے مونہہ اتنی باتیں۔ آخر صنوبر نیچے اتر آئی اور

مہمانوں کے درمیان ایک میز پر ٹوکرا رکھ دیا گیا۔ سب بے چین ہوگئے۔ کوئی کھڑا ہوگیا، کوئی جھک گیا۔ کوئی اسے چھوکر دیکھنے کو آگے بڑھا، مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سوراخ دار ٹوکری میں آخر ہے کیا۔

میں مارے خوشی کے بلا وجہ قہقہہ پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ جسوتی ناچنے لگی تھی۔ مگر ریحانی ایک ستون کا سہارا لیے باغ کے زینے کے پاس بت بنے کھڑے تھے۔ ایک دفعہ تو انھوں نے ہم سب کی نظر بچا کر مجمع میں سے یک لخت بھاگ جانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس پر دادی زبیدہ نے زیرلب ڈانٹا بھی تھا کہ ''یہ کیا حرکت ہے آدمی بنو۔'' آخر اس جادو کی ٹوکری کے کھلنے کا وقت آگیا کچھ نہ پوچھیے ہمارے دل فراکوں کے نیچے کس زور سے دھڑک رہے تھے۔

دادی زبیدہ ٹوکری کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔ اسے کھولنے کی نیت سے اس پر ہاتھ رکھ کر فخر سے بولیں ''اب دیکھو میرا تحفہ آؤ بچو اور قریب آجاؤ۔ تم بھی کیا یاد کروگی روحی۔ تحفہ دیکھ کر تم پھولے نہ سماؤ گی۔ اب میں ٹوکری کا ڈھکنا اٹھاتی ہوں۔

ایک دو۔ تین۔ لو اٹھا دیا میں نے ڈھکنا— یہ رہا وہ عجیب تحفہ—!''

ڈھکن کھل گیا، ساتھ ہی سب کے مونہہ بھی فرطِ حیرت سے کھل گئے۔ مہمان بچے قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ میں زور سے رو پڑی کیونکہ ٹوکری خالی تھی۔

دادی جان کا چہرہ فق ہوگیا۔ گرج کر بولیں ''یہ کس کی شرارت ہے؟ تحفہ گیا کہاں؟''

دادی جان کا فقرہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک دم بجلی کی سی تیزی سے کوئی چیز باغ کی جھاڑی پر سے کود کر دماغوں کی نظروں کے آگے سے نکل گئی۔ چلی گئی۔ غائب ہوگئی۔ دادی زبیدہ خوف زدہ ہوکر بولیں ''ہائیں! یہ کیا چیز تھی۔ اصطبل سے کوئی گھوڑا کھل گیا ہے؟''

جسوتی باغ کی دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ چلا کر بولی ''ارے گھوڑا نہیں یہ تو ریحانی بھاگے جا رہے ہیں۔''

''ریحانی؟'' دادی زبیدہ نے حیران ہوکر کہا ''اچھا اب میں سمجھ گئی شرارت اسی کی ہے۔ بلاؤ اسے۔'' وہ غصے سے چیخیں۔

ہم سب ریحانی کو پکڑنے کے لیے باغ میں بھاگے جا رہے تھے۔ مگر وہ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر اس تیزی سے نکل جاتے تھے کہ عین اپنا رخ اچانک بدل دینے کے باوجود ہاتھ نہ آتے تھے۔ دوبارہ دوڑ شروع ہوگئی۔

سب سے پہلے میں، میرے پیچھے جسوتی۔ جسوتی کے پیچھے سارے مہمان لڑکے اور لڑکیاں۔ ان کے پیچھے باغ کے مالی، مالیوں کے پیچھے کتے اور کتوں کے پیچھے دادی زبیدہ ہاتھ میں ایک ڈنڈا لیے بھاگی چلی آ رہی تھیں۔ مگر اللہ رے ریحانی تیر کی طرح دیوار پھاند کر کھیتوں میں نکل گئے۔ آخر ہم سب تھک تھکا کر واپس آگئے۔ شام ہونے کے بعد مہمان بھی رخصت ہوگئے۔ جب کہیں جا کر رات کے اندھیرے میں ریحانی باغ کے کنویں کے پاس گرفتار کیے جاسکے، وہ بھی بوڑھے باورچی نے انھیں اتفاقاً پکڑ لیا۔ وہ بھی اس طرح کہ باورچی جھک کر پانی کی بالٹی اٹھا رہا تھا کہ اس کی لمبی ٹوپی کا سرا ریحانی کی ناک سے جا سرسرایا۔ اس سے انھیں چھینک آئی۔ چھینک کی آواز سن کر باورچی نے ہاتھ بڑھا کر انھیں گرفتار کرلیا، ہم انھیں پکڑ کر اندر لے آئے۔

وہ چور بلے کی سی شکل بنائے دادی زبیدہ کے حضور میں جا کھڑے ہوئے ''دادی جان پیاری، سارا قصور میرا ہی ہے۔

وہ رو رو کر اقرار جرم کر رہے تھے ”وعدہ کیجیے کہ آپ بخش دیں گی، پھر میں پورا قصہ سناؤں گا۔“

”کہو جو کہنا چاہتے ہو؟“ — احمق کہیں کے، دادی زبیدہ دانت پیس کر کہنے لگیں۔

”اس طرح آپ دانت بجائیں گی اور، اور — یوں مجھے ڈرائیں گی تو میں ہرگز ہرگز قصہ نہ سناؤں گا۔“ ریحانی بھیا رو کر کہنے لگے۔ دادی زبیدہ کہنے لگیں ”ایک تو تم نے شرارت کی، دوسرے اب شرطیں لگانے لگے کہ یہ کرا تو میں نہ کہوں گا، وہ کرا تو میں نہ سناؤں گا، بتاؤ کیا کیا تھا تم نے؟“

ریحانی لرزتی ہوئی آواز میں بولے ”ہوا یہ، میں رات کے وقت آپ کی خواب گاہ میں جا کر ٹوکری الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کا ڈھکنا خود بخود کھل گیا۔ ایک بجلی سی کوند گئی اور کوئی چیز اس تیزی سے اچھلتی کودتی میری آنکھوں کے سامنے سے نکل بھاگی کہ میں ہکا بکا رہ گیا، روحی کے سر کی قسم۔ میں اب تک نہ پہچان سکا کہ اس ٹوکری میں کیا بلا تھی۔“

دادی جان بولیں ”ارے بے وقوف لڑکے! ہائے ہائے۔ کس مصیبت سے میں نے روحی کے لیے انگورا کا ایک ترک بلاّ منگوایا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ٹوکری میں بند کیا تھا۔ مہمانوں کے آگے جو بے عزتی ہوئی وہ تو ہوئی ہی تھی مگر جو مایوسی روحی کو ہوئی وہ الگ!“

ریحانی بولے ”مگر دادی جان۔ روحی نے جھوٹ کہا تھا، اس کی سالگرہ تو سردیوں میں آتی ہے۔ آپ بھول رہی ہیں — اسے جھوٹ کی سزا مل گئی۔“

دادی زبیدہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگیں ”سچ مچ؟“ — ایک تو تمھاری یہ حرکت — اس پر روحی کا یہ جھوٹ۔ لعنت ہے تم لوگوں کی شرارتوں پر — “

دادی زبیدہ کے غصے کا پارہ ایک سو بیس درجے کو چھو رہا تھا اور ریحانی کی بجائے اب میں اپنے زرق برق گلابی جوڑے میں مجرموں کی طرح سر جھکائے پشیمان کھڑی تھی!

■

جوابات

بانو سرتاج

صفائی مہم

اتوار کی صبح تھی۔

یونس، ادریس اور انیس علی الصبح جاگے، برش کیا، اسپورٹس ڈریس زیب تن کی، فٹ بال سنبھالی اور اپنی اپنی سائیکلیں سنبھالے ہوا ہوگئے۔

یہ وہی تکڑی تھی جسے سویرے اسکول بھیجنے کے لیے پانچ پانچ منٹ پر آوازیں لگانی پڑتی تھیں۔ یونس، ادریس بڑوں کے ساتھ مسجد ضرور جاتے مگر لوٹ کر پھر بستر پر پڑ جاتے۔ بڑی مشکل سے تیار ہوتے، اسکول جاتے۔

آج بھی تکڑی فٹ بال گراؤنڈ کے لیے روانہ ہوئی تب سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ دادی جان جھولے پر بیٹھیں پان لگا رہی تھیں اور بڑی امی، چھوٹی امی چائے پی رہی تھیں..... مگر 2 گھنٹوں کے بعد تینوں لوٹے تو سب کچھ الٹا پلٹا ہو چکا تھا۔

دادی جان اور بڑی امی باغیچہ میں پودوں کے ساتھ الجھی ہوئی تھیں۔ انھیں اطمینان ہوا کہ چھوٹی امی یقیناً ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہوں گی۔

جلدی جلدی جوتے اتار کر وہ اندر بھاگے تو چھوٹی امی دوپٹہ کمر میں لپیٹتی ہوئی باہر آئیں، بولیں ”ناشتہ ٹیبل پر رکھا ہے۔“ اور دادی اور بڑی امی کے ساتھ کام میں لگ گئیں۔

بچے سویرے کھیلنے جانے کی ایسی جلدی مچاتے کہ لاکھ بولنے پر بھی دودھ کے گلاسوں کو ہاتھ نہ لگاتے۔ لوٹتے تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہوتے۔ یونس نے بے صبری سے روٹیوں کا ڈبہ کھولا، اس امید میں کہ سموسے، کچوری یا پوری ہوگی۔ پراٹھے دیکھ کر سب کے منہ لٹک گئے۔

”اُف! ٹھنڈے پراٹھے!“ انیس نے منہ بنا کر کہا۔

”اور صرف آملیٹ۔“

”وہ بھی ٹھنڈا.....“

”خاموشی سے کھاؤ۔ کھانے کو برا نہیں کہتے۔“ ادریس نے سمجھداری سے کام لیا۔

ناشتہ ختم کر کے تینوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

زبان سے کوئی کچھ نہ بولا مگر دل کی زبان سے باتیں شروع ہوگئیں۔

''بڑی امی کہتی ہیں، اتوار کے روز ہی تو تم لوگ چین سے ناشتہ کرتے ہو۔''

''اور کیا؟ ورنہ اکثر ہی کپڑے بدلتے وقت انھیں ہمارے منہ میں نوالہ دینا پڑتا ہے۔''

''چھوٹی امی تو رات ہی کو پوچھ لیتی ہیں کہ سویرے کیا کھاؤ گے؟''

''ہم لوگ کھیل کر واپس آتے ہیں تو تازہ ناشتہ تیار ملتا ہے۔''

اُسی وقت منی نے آکر پوچھا ''بھائی جان، آج کس کی ٹیم کو فتح حاصل ہوئی؟''

اُس کی بات کا جواب نہ دے کر ادریس نے پوچھا ''منّی، تجھے پتہ ہے آج ناشتہ میں کوئی چٹپٹی چیز کیوں نہیں بنی؟''

''معلوم ہے۔'' منّی نے اطمینان سے کہا۔

''تو بتاؤ نا کیوں نہیں بنی؟''

''اس لیے کہ ممی لوگ دادی جان کے ساتھ باغیچے میں مصروف ہیں۔'' بے نیازی سے کہہ کر منّی آنگن میں پہنچ گئی۔ تینوں اس کے پیچھے تھے۔ جا کر جھولے پر بیٹھ گئے۔

بڑی امی کٹر سے سوکھی شاخیں اور پتے کاٹ رہی تھیں، دادی جان کیاریوں میں سے کچرا نکال رہی تھیں۔ چھوٹی امی تھیلے میں کچرا جمع کر رہی تھیں۔

''دادی جان، ہم کچھ مدد کریں؟'' انیس نے پوچھا۔

''جی نہیں، شکریہ'' چھوٹی امی نے فوراً کہا ''آپ تینوں جھولے پر بیٹھے بہت اچھے لگ رہے ہو۔'' انیس کھسیا کر رہ گیا۔

دادی جان نے بات سنبھالی'' ملائمت سے بولیں'' رہنے دو تمھارے ہاتھ گندے ہو جائیں گے۔''

''آخر آپ لوگ کیا کر رہی ہیں؟'' ادریس نے حیرت سے پوچھا۔

''اپنا آنگن سجا رہے ہیں۔'' دادی نے سیدھے کھڑا ہو کر کہا۔ دراصل مسلسل جھکنے سے ان کی کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ بات کرنے کے بہانے کمر سیدھی کر لینا چاہتی تھیں۔

''ابھی تم لوگوں کے پاپا بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔ اپریل کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ گرمی اور دھوپ بڑھے گی۔ پرندوں کے لیے پیاؤ بنے گا، جھولا بنے گا گھنی شاخوں میں....''

یونس نے کہا ''تو آپ لوگ یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟ مالی بابا کو بلا لیتیں۔''

''اپنا گھر ہے، اپنا گھر سجانے کے لیے دوسروں کو کیوں بلائیں؟'' چھوٹی امی کا جواب تیار تھا۔

''مالی، مہینہ میں ایک دن آتا ہے..... بقیہ دنوں ہم لوگ یہ کام کر لیں گے۔'' بڑی امی نے بات کو واضح کیا۔

''ہم سے کیوں نہیں کہا؟'' انیس پھٹ سے بولا۔

چھوٹی، بڑی امی نے دادی جان کی طرف دیکھا۔ وہ نرم لہجے میں بولیں ''وہ بات یہ ہے کہ آنگن کو سجانے سے پہلے صفائی کرنی پڑتی ہے اور صفائی کو تم لوگ گندہ کام سمجھتے ہو۔ مان لو، تم سے کہتے بھی تو جواب کیا ملے گا یہ ہمیں معلوم ہے..... تم لوگ کہتے صفائی گندہ کام ہے۔ ہم نہیں کریں گے، اور باہر کھیلنے بھاگ جاتے۔''

دادی جان کو باغیچے کا بہت شوق تھا۔

دادی جان تینوں لڑکوں سے کہتیں کہ چھٹی کے روز باغیچہ صاف کردیا کرو تو صاف انکار کردیتے، ہم نہیں کریں گے۔ صفائی گندہ کام ہے۔

ادریس، یونس، انیس تینوں کے دماغ کی ٹیوب لائٹس روشن ہوگئیں۔

ادریس دوڑ کر ایک کرسی لے آیا۔ دادی جان کو اس پر بٹھا دیا۔ منی دوڑ کر دادی جان کی کمر دبانے لگی۔

یونس نے بڑی امی کے ہاتھ سے جھاڑو تو انیس نے چھوٹی امی کا کھمیلا لے لیا۔ وہ دونوں اندر چلی گئیں۔ چھوٹے ابا بڑے ابا بھی آگئے۔ پیاؤ لگ گئے، جھولے لٹکنے لگے..... آنگن چمکنے لگا۔

کچرا باہر ڈال کر اسے جلانے کے بعد بچے گھر کے اندر آئے۔ پورے خاندان نے دسترخوان پر بیٹھ کر گرما گرم سموسے املی کی چٹنی کے ساتھ کھائے، پھر چاروں بچے ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کہاں؟ اب کارٹون شو دیکھو گے؟ دیکھو، دیکھو، خوشی سے دیکھو۔''

''نہیں، دھوپ تیز ہونے تک آنگن میں کھیلیں گے، پھر کارٹون شو۔'' ادریس نے سب کی طرف سے جواب دیا۔

''باغیچہ بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔''

''اماں۔'' بچوں کے جانے کے بعد بڑے ابو نے پوچھا ''آخر آپ نے یہ جادو کیسے کیا؟''

''میں نے جادو نہیں کیا، اپنی غلطی درست کی ہے۔'' دادی جان نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے؟ اماں کیسے؟ ذرا سمجھائیے تو!'' چھوٹے ابو نے تجسس سے کہا۔

''ادریس، انیس سے میں ہمیشہ کہتی تھی کہ اتوار کو چھٹی ہوتی ہے، تھوڑا سا وقت نکال کر باغیچے کا کچرا صاف کردیا کرو مگر دونوں صفائی گندہ کام ہے، کہہ کر کنی کاٹ لیتے تھے۔ میں ان کی غلط سوچ کو سدھارنے میں ناکام رہی مگر اس روز ہمارے وزیراعظم کی تقریر سنتے ہوئے مجھے مسئلہ کا حل مل گیا۔''

''اماں آپ گریٹ ہیں۔ پوری تفصیل تو بتائیے۔''

''وزیراعظم مثبت اور منفی سوچ کے بارے میں بات کررہے تھے۔ انھوں نے کہا ''تصویر کے دونوں رخ ہمارے سامنے ہوتے ہیں مگر منفی سوچ پہلے اثرانداز ہوتی ہے..... انھوں نے مثال دی، صفائی مہم کے تحت مقامی انتظامیہ کی طرف سے صفائی ملازموں کی تقرری کی گئی ہے..... وہ سیٹی بجا کر اپنے آنے کی اطلاع دیتا ہے تو ہم کہتے ہیں'' کچرے والا آیا ہے..... بھلا کہو تو؟ وہ کچرے والا کیسے ہوا؟ وہ صفائی والا ہے، جو سب کو اپنا مکان، گھر، آنگن، سڑک صاف رکھنے کی تحریک دیتا ہے، صاف رکھنے میں سب کی مدد کرتا ہے.....''

چاروں، بیٹے، بہو حیرت سے منہ کھولے دادی جان کو دیکھ رہے تھے۔ یہ وہی دادی جان تھیں جو تمام دن بیٹھیں عورتوں کے سیریل دیکھا کرتی تھیں۔ بے کار، بکواس سیریلس میں سے حقیقت کا آبدار موتی کتنی عمدگی سے ڈھونڈ لائی تھیں وہ!

''بہوؤں کو ساتھ لے کر میں نے کچرا صاف کرنا شروع نہیں کیا تھا بلکہ آنگن کو سجانے سنوارنے کا کام ہاتھ میں لیا تھا جسے میرے نٹ کھٹ شہزادوں نے مکمل کردیا۔ میں خوش ہوں۔''

خوش تو واقعی سب تھے۔

■

Dr. Bano Sartaj
Opposite Akashwani, Civil Lines
Chandrapur - 442401 (Maharashtra)

عبدالناصر

بلّی نے درخت پر چڑھنا کیسے سیکھا؟

ایک دن کی بات ہے، حماد اپنے بھائی کے ہمراہ باغ کی سیر کو گیا۔ اس دوران اس نے وہاں کوّوں اور دوسرے پرندوں کو شور مچاتے ہوئے دیکھا۔ اتنے میں ایک جنگلی بلّی بھاگتی ہوئی وہاں آئی اور پیڑ پر چڑھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیڑ کے موٹے تنے پر چھپ کر بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر حماد نے اپنے بھائی سے سوال کیا۔ ”یہ بلّی اچانک پیڑ پر کیوں چڑھ گئی کیا اسے پیڑ پر چڑھنا بھی آتا ہے؟“

اس کے بھائی نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ عام طور پر بلّیاں گھروں میں رہنا پسند کرتی ہیں لیکن جب اسے کوئی بڑا خطرہ یا جان جانے کا خوف محسوس ہوتا ہے تو وہ ایسا کرتی ہیں۔“

لیکن حماد کو اپنے بھائی کے جواب سے تشفی نہ ہوئی بلکہ بچوں کی عادت کے مطابق وہ کچھ اور زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً دوسرا سوال کر دیا کہ ہمارے گھر میں جو بلّی پلی ہے کیا اسے بھی پیڑ پر چڑھنا آتا ہے؟

”بے شک، وہ بھی ایسا کرنا جانتی ہے۔“ یہ اس کے بھائی کا جواب تھا۔ ”لیکن میں نے تو اسے کبھی ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ شاید وہ پیڑ پر چڑھنا بھول گئی ہے۔“ اس نے سادگی سے پھر سوال کیا۔

اس کے بھائی نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور بولے ”سبھی بلّیاں پیڑوں اور دیواروں پر چڑھنا جانتی ہیں۔“ تم بھی کسی دن اپنی بلّی کو ایسا کرتے ہوئے خود دیکھو گے۔“

اگلے دن حماد نے اسکول آنے کے بعد پالتو بلّی کو اپنے

بازوؤں میں بھرلیا اور پڑوس کے ایک درخت کے پاس لے جاکر بولا "ذرا مجھے اس پیڑ پر چڑھ کے تو دکھانا۔ مجھے معلوم ہوا کہ تو بھی پیڑ پر چڑھنا جانتی ہے۔"

حماد کی باتوں کا بلی پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ میاؤں میاؤں کرتی اور اپنی دُم ہلاتی ہوئی گھر کی جانب لوٹ گئی۔ اتنے میں اس کی امّی بھی اسے تلاش کرتی ہوئی وہاں آگئیں تو دیکھا کہ بلی آگے آگے اور میاں حمّاد اس کے پیچھے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انھوں نے پوچھا:

"کہو کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سے نظر آرہے ہو؟"

"ہاں امّی میری بلی پیڑ پر چڑھنا بالکل نہیں جانتی اس لیے میں اسے پیڑ پر چڑھنا سکھاؤں گا مگر یہ سیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی۔" حمّاد نے معصومیت سے سب کچھ کہہ ڈالا۔

"کسی دن یہ خود سے ہی پیڑ پر جاکر بیٹھ جائے گی تب تم دیکھ لینا کہ اسے پیڑ پر چڑھنا آتا ہے یا نہیں۔" امی نے کہا۔

"مگر میں تو اسے آج ہی پیڑ پر چڑھنا سکھاؤں گا۔ یہ اچھی خاصی تو ہے لیکن پیڑ پر چڑھنا نہیں جانتی ہے۔ البتہ مہینے میں دو چار چوہے ضرور پکڑ لیتی ہے۔ اتنا کہتے ہی وہ پھر اُسے اٹھا کر پیڑ کی جانب لے جانے لگا۔

"ٹھہرو ٹھہرو۔ اسے تنگ مت کرو ورنہ یہ تم کو کاٹ لے گی۔" لیکن حماد تب تک دوڑتا ہوا پیڑ تک پہنچ گیا اس نے بلی کو زمین پر رکھتے ہوئے کہا "اب جلدی سے پیڑ پر چڑھ جا ورنہ میں تمھاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ بے عقل کہیں کی۔

"بیٹا یہ جانور ہے کوئی انسان نہیں جو تمھاری باتوں کو سن لے۔ بہتر ہے کہ اسے تنگ کرنے کی بجائے تم خود بھی گھر چل کر کھاؤ پیو اور آرام کرو۔ اسے کسی دوسرے دن پیڑ پر چڑھنا سکھا دینا۔ امی نے اس کا دھیان موڑتے ہوئے کہا۔ پھر بھی حماد کا تجسس برقرار تھا۔

شام کو جب اس کے پاپا گھر آئے تو اس نے موقع پا کر ان سے اپنا سوال دہرایا کہ کیا سبھی بلیاں پیڑوں پر چڑھنا جانتی ہیں؟

"ہاں بیٹے۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ انھوں نے پوچھا۔"

"اس لیے کہ ہماری بلی کو ابھی تک پیڑ پر چڑھنا نہیں آیا۔" میں نے سوچا کہ اپنی بلی کو بھی پیڑ پر چڑھنا سکھاؤں گا لیکن یہ سیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے۔

"آج رات میں تمھیں ایک کہانی سناؤں گا جس سے تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ تمام بلیاں آج بھی پیڑوں پر چڑھنا جانتی ہیں۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔" اس کے پاپا نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

اس وقت تو حماد مطمئن ہو گیا مگر رات ہوتے ہی وہ اپنے پاپا سے کہانی سنانے کی ضد کرنے لگا۔ اب اس کے پاپا نے جو کہانی اسے سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔

بات پرانے زمانے کی ہے۔ کسی ملک میں ایک راجہ تھا۔ اس کے ملک میں جنگلات کی کثرت تھی جس میں ہر قسم کے جانور جن میں چرند پرند اور درندے بھی رہا کرتے تھے۔ جب درندے کی کثرت ہو جاتی تو کبھی کبھار وہ آبادیوں میں بھی آجایا کرتے تھے اور کبھی کسی کسان کی بکری یا گائے، بھینسوں کو لقمہ بنالیا کرتے تھے۔ جس کی شکایت لوگ راجہ سے کیا کرتے تھے۔ اس موقعے پر راجہ کے فوجی جنگل کے قریب جاکر ڈھول اور نقارے بجاکر جنگلی درندوں کو ڈرا دیا کرتے تھے۔ پھر یہ درندے آبادی کا رخ نہیں کرتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جنگلی درندے کا آبادی پر حملہ کچھ بڑھ گیا اور راجہ کے پاس برابر شکایتیں آنے لگیں۔ آخر راجہ نے

ایک دن اعلان کیا کہ وہ اس ماہ جنگل میں جانوروں کا شکار کرنے جائے گا۔ یہ سن کر لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

بس پھر کیا تھا۔ چند ہی روز میں تمام تیاریاں پوری کر لی گئیں اور راجہ کے ساتھ شکاریوں کا پورا قافلہ جنگل کی طرف چل پڑا اور وہاں جا کر انھوں نے کئی جگہ پڑاؤ ڈال دیے جسے دیکھ کر جنگل کے جانور ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ راجہ کے شکاریوں نے ان میں سے اکثر جانوروں کو اپنا نشانہ بنانا شروع کیا لیکن جنگل کا راجہ شیر ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔

راجہ نے جنگل میں ڈھول بجانے کا حکم دیا تا کہ جنگل کا راجہ شیر سامنے آئے مگر کئی دنوں تک ایسا نہیں ہوا البتہ دوسرے جانور سامنے آئے جن کا راجہ اور ان کے شکاریوں نے شکار کیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ اچانک ایک صبح یہ خبر ملی کہ شیر نے ایک شکاری کو ہی اچک لیا ہے۔ خبر لانے والے ملازم سے راجہ نے پوری تفصیل طلب کی تو اسے اندازہ ہوا کہ جنگل کے بیچوں بیچ شیر کی ماند ہے۔ جس کے قریب پہنچنا بے حد خطرناک ہے۔ اس جھنڈ میں کئی شیر ہیں۔ جو بے حد خونخوار ہیں۔

''حضور ان کا شکار کرنا خطرے سے خالی نہیں'' ملازم نے دست بستہ عرض کیا۔

''مگر مجھے تو اپنی جنتا کے لیے ان کا شکار کرنا ضروری ہے تا کہ لوگوں کے دلوں سے ڈر دُور ہو جائے۔'' راجہ نے ہمت بھرے انداز میں جواب دیا۔ اب راجہ دوسرے جانوروں کا شکار چھوڑ کر صرف شیر کے شکار کے لیے ذہن تبدیل کر چکا تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ پیڑوں پر مچان بنائے گئے اور جا بجا پیڑوں سے بکریوں، بھیڑوں اور گایوں کو باندھ دیا گیا تا کہ جب وہ ان کو کھانے کے لیے آئے تو راجہ کے ہمراہ شکاری اس پر ٹوٹ

پڑیں اور شیر کا خاتمہ کردیں لیکن شیر پھر کئی دن نظر نہیں آیا اور جب آیا تو اس نے دوسرے شکاری کو زخمی کردیا لیکن شکاریوں میں سے کچھ نے ہمت دکھاتے ہوئے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اب صورت یہ تھی کہ شیر آگے آگے اور تمام شکاری پیچھے پیچھے جنگل کا چپہ چپہ چھان رہے تھے۔

"پھر کیا ہوا پاپا؟" حماد نے کہانی کو غور سے سنتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" اس کے پاپا بولے۔ ہوا یہ کہ جب شکاریوں نے ہر طرف سے شیر کو گھیر لیا اور اسے اپنے نشانہ پر لے لیا تو ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔ شیر نے کسی پر حملہ کرنے کی بجائے چاروں ہاتھ پاؤں کی مدد سے ایک پیڑ پر چڑھنا شروع کردیا اور کافی بلندی تک چڑھتا ہی چلا گیا اور پھر پتوں کے درمیان چھپ کر بیٹھ گیا۔

"پھر کیا ہوا؟ حماد نے جھٹ دوسرا سوال کردیا۔

راجہ اور اس کے دوسرے شکاری نے شیر کو پیڑ سے اتارنے کے لیے پہلے تو پتھروں کی بارش کی لیکن شیر نہیں اترا تب انھوں نے تیر کمان سنبھال لیا اور تیر چلانا شروع کیا مگر شیر اس طرح خاموش بیٹھا رہا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ البتہ پیڑ کی ٹہنیاں ہلتی نظر آئیں جسے دیکھ کر راجہ نے کہا وہ رہا شیر۔ وہ رہا شیر.......... دیکھو بچ کے نہ جانے پائے اور پھر ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔

"وہ کیا؟" حماد کا تجسس لگاتار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"ہوا یہ کہ شیر جس ٹہنی پر بیٹھا ہوا تھا وہ اس کا بوجھ برداشت نہ کرسکی اور زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹ کر نیچے آگری۔ اب شیر نے خود کو زمین پر پایا تو اس کے چاروں طرف شکاری کا جمگھٹا تھا۔ چند لمحے تک تو وہ ہکا بکا دیکھتا ہی رہ گیا۔ لیکن پھر ہمت کرکے نو دو گیارہ ہو گیا۔

راجہ اس طرح شیر کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی حیران تھا کہ پکڑ میں آیا ہوا شیر پھر ہاتھ میں نہ آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔

"وہ کیا؟" حماد نے پھر پوچھا۔

اب جو شیر جان بچا کر بھاگا تو دوبارہ نظر ہی نہیں آیا۔ آخر تھک ہار کر راجہ نے ایک ہفتہ بعد تمام شکاریوں کو واپس لوٹ جانے کا حکم دیا اور وہ سبھی راجہ کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔

راجہ اور شکاریوں کے حملے سے ڈرا سہا شیر جب اپنے جھنڈ میں واپس لوٹا تو اس سے سبھی نے حال دریافت کیا۔ شیر نے اپنے خاندان کے تمام جانوروں کو اپنے پاس بلایا اور انسانوں سے اپنی جان بچانے کا طریقہ سمجھایا اور یہ بھی بتلایا کہ تیز دوڑ بھاگ کے علاوہ پیڑ پر چڑھنے کا سب کو ہنر بھی آنا چاہیے۔ اس کو گرہ میں باندھ رکھو۔ وہ دن اور آج کا دن۔ بلی کی نسل کے تمام درندے اس بات کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی علاقے اور ملک میں کیوں نہ رہتے ہوں۔

اتنا سنتے ہی حماد فوراً بول اٹھا۔ "پاپا میں سب کچھ جان گیا اب میں اپنی پیاری بلی کو کبھی تنگ نہ کروں گا۔"

ہاں بیٹے شاباش۔ اب رات زیادہ ہوچکی ہے تم جاکر آرام کرو۔ کل صبح وقت پر جاگ جاؤ تو تم بھی شیر سے زیادہ تندرست اور پھرتیلے بن جاؤ گے۔" اور وہ فوراً بستر پر سونے چلا گیا۔

■

Dr. Abdun Nasir
C-24, Okhla Vihar, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

کیسے سمجھاؤں نانی کو

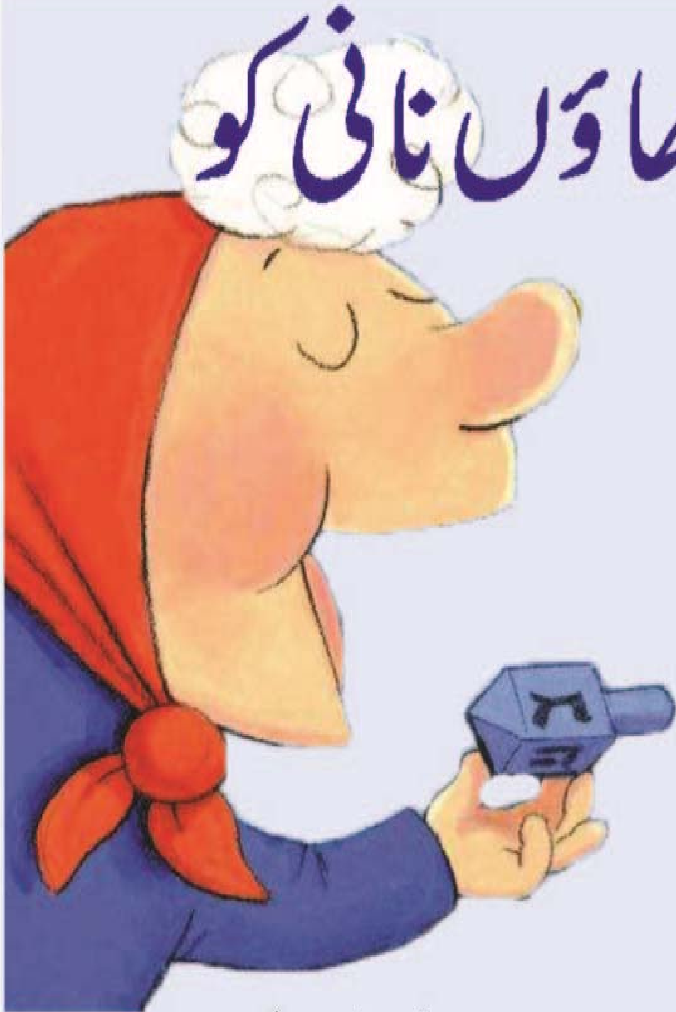

دس روپے فی بوتل پانی
ہکا بکا رہ گئی نانی
اپنا بچپن یاد کیا تو
ارزانی سی تھی ارزانی

بارہ آنے سیر اصلی گھی
گیارہ آنے تولا چاندنی
کیلے تھے دو پیسے درجن
چاول پانچ آنے پنسیری

بائسکوپ ٹکٹ ایک آنہ
ایک اٹھنی کا پاجامہ
اسکولوں میں فیس نہیں تھی
کالج دو روپے ماہانہ

نانی کی تنخواہ جو پوچھی
کل پینتالیس روپے نکلی
پینتالیس ہزار کے لگ بھگ
پاتے ہیں ابو اور امی!

دس روپے فی بوتل پانی
ہکا بکا رہ گئی نانی
اپنا بچپن یاد کیا تو
ارزانی سی تھی ارزانی

Shaad Fatima D/o Nasir Khan
ARES Eng School
Altamash Colony, Aourangabad (MS)

امان الحق

شتر مرغ

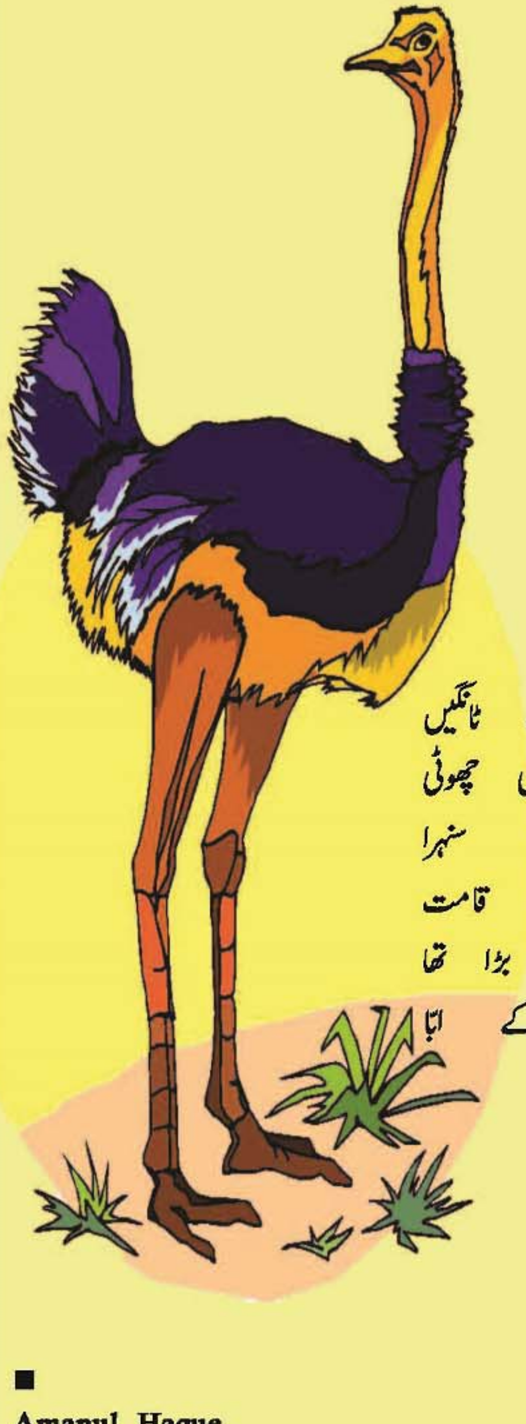

اس بار اک پرندہ
ہم نے عجیب دیکھا
جس کی بڑی تھیں آنکھیں لمبی تھیں خوب ٹانگیں
گردن تھی اونٹ جیسی پر دُم ذرا تھی چھوٹی
رنگت میں تھا وہ بھورا چتلا کوئی سنہرا
مرغے سی تھی جسامت اونچی مگر تھی قامت
نزدیک جب کھڑا تھا قد سے مرے بڑا تھا
پوچھا جو نام اس کا بولے صفی کے ابا
ہے شتر مرغ بچو
یہ نام یاد رکھو

Amanul Haque
Jawli Bes, Old City, Balapur
Distt. Akola - 444302 (Maharashtra)

زیبا فاروقی

زینب کی چڑیاں

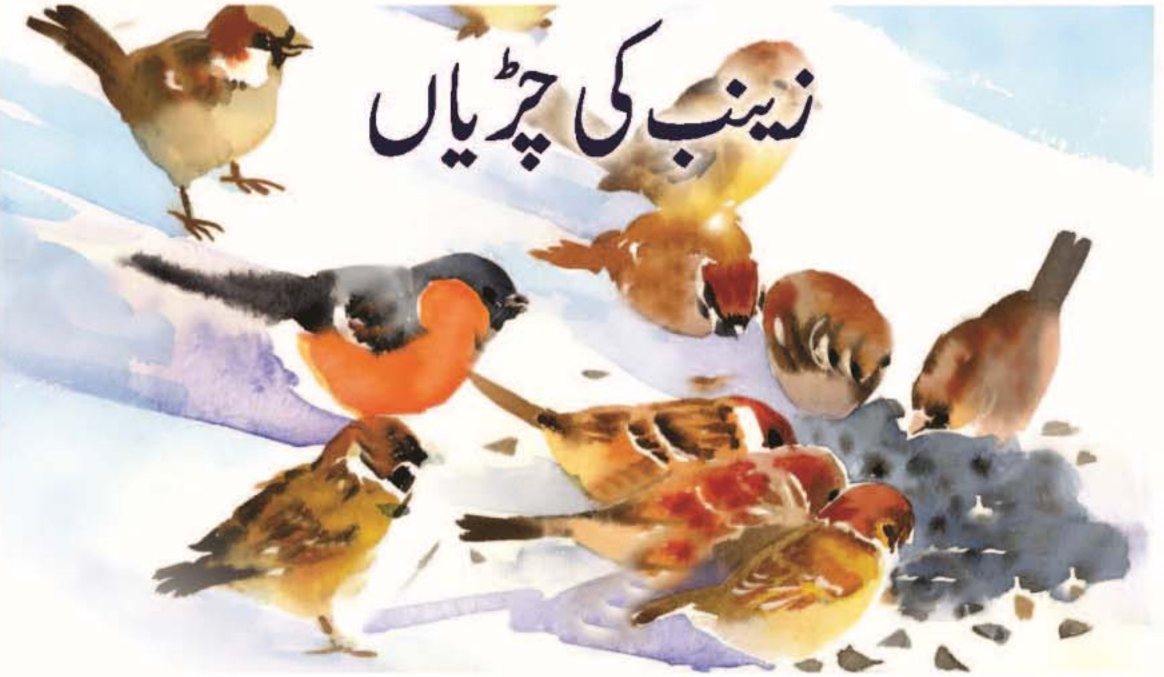

آنگن میں دھوپ ذرا تیز ہوئی تو امی نے گیہوں دھو کر سکھانے کو پھیلا دیے۔ چارپائی پر پھیلے گیلے گیہوؤں پر ہاتھ پھرانے میں ننھی زینب کو بڑا مزہ آ رہا تھا۔ گیہوں پھیلا کر امی باورچی خانے میں چلی گئیں تو زینب بھی برآمدے میں دادی کے پاس بیٹھ کر گڑیوں سے کھیلنے لگی۔ اتنے میں نہ جانے کہاں سے اِتنی بہت سی چڑیاں آ گئیں۔ غول کی غول۔ گیہوؤں پر ٹوٹ پڑیں۔ زینب کو یہ منظر بڑا اچھا لگا۔ وہ خوشی سے کود کود کر تالیاں بجانے لگی۔ چڑیوں کا شور سن کر امی نے پہلے تو باورچی خانے سے باہر جھانکا۔ پھر جلدی سے آ کر چڑیاں اڑا دیں۔

زینب نے التجا کی— ”امی۔ چڑیوں کو تھوڑا سا دانہ کھا لینے دیجیے نا۔“

”اچھا—“ امی ذرا غصے سے بولیں۔ ”میں نے اتنی محنت کیا چڑیوں کو کھلانے کے لیے کی ہے۔“

دادی اماں نے زینب کو سمجھایا ”دیکھو بیٹا۔ یہ گیہوں تو ہم لوگوں کے کھانے کے لیے ہیں۔ چڑیوں کے لیے ابا سے دانہ منگوا لینا اور روز انھیں کھلانا۔“

بات زینب کی سمجھ میں آ گئی۔ شام کو ابا دفتر سے لوٹے تو زینب تیار بیٹھی تھی۔ فوراً ان کے گلے میں جھول کر بولی۔ ”ابا چڑیوں کے لیے دانہ لا دیجیے۔“ ابا پہلے تو اس فرمائش پر حیران ہوئے۔ پھر پوری بات معلوم ہوئی تو ہنسنے لگے۔ بولے ”ہاں بیٹا— ہم آپ کی چڑیوں کا دانہ ضرور لا دیں گے جس سے کہ وہ پھر آپ کی امی کے دھوئے ہوئے گیہوؤں پر حملہ نہ کریں۔“

چائے اور نماز سے فارغ ہو کر ابا نے محلے کی دکان سے کچھ باجرا اور چاول کی کنکی لا دی۔ دادی اماں مٹی سے دو پیالے لائیں۔ ایک میں دانہ رکھا اور دوسرے میں پانی۔ پھر انھیں آنگن کے ایک کونے میں، وہیں جدھر کیاریاں بنی تھیں، رکھ دیا۔ ویسے زینب خود پیالوں کو رکھ آتی لیکن وہ ابھی چھوٹی

تھی نا اور مٹی کے برتن بھاری تھے۔ کہیں اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتے تو۔ خیر پھر بھی وہ دادی کے ساتھ ساتھ پیالے رکھوانے تو گئی ہی تھی۔

''اچھا بیٹا۔ اب تم سو جاؤ۔ ابھی چڑیاں بھی سو رہی ہیں۔ صبح کو دانہ کھانے آئیں گی۔ تب ان کو دیکھنا۔'' دادی اماں نے کہا۔

زینب خوشی خوشی سونے چلی گئی۔ خواب میں بھی اس نے بہت ساری پیاری پیاری چڑیوں کو دیکھا۔ لال، نیلی، سفید، سنہری چڑیاں۔ وہ اس کے آس پاس پھدک پھدک کر دانہ کھا رہی تھیں اور اسے تھینک یو بول رہی تھیں۔ ایک چڑیا تو اس کے کندھے پر بیٹھ کر گانا گا رہی تھی۔

پھر بڑی جلدی صبح ہو گئی۔ زینب جاگتے ہی فوراً آنگن کی طرف بھاگی۔ ارے یہاں تو کوئی بھی چڑیا نہیں۔ برآمدے میں دادی بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ زینب رونی صورت لے کر دادی کے پاس پہنچی۔

''دادی اماں! چڑیاں تو نہیں آئیں۔''

ارے بیٹا۔ ابھی تو چڑیاں اپنے گھر میں ہاتھ منہ دھو رہی ہوں گی۔ تم بھی تو صبح اٹھ کر برش کرتی ہو نا۔ امی تمھارا منہ دھلاتی ہیں۔ ذرا صبر کرو۔ آئیں گی چڑیاں۔ آئیں گی۔ دادی نے سمجھایا۔

ارے واقعی۔ تھوڑی ہی دیر میں بہت ساری چڑیاں چوں چوں کرتی وہاں آ گئیں۔ زینب خوشی سے ناچ اٹھی۔ وہ اپنے سارے کھیل تماشے بھول کر چڑیوں میں مشغول ہو گئی۔ اب یہ چڑیا آئی۔ وہ والی چڑیا اڑ گئی۔ وہ چھوٹی چڑیا پانی پی رہی ہے اور یہ بھوری چڑیا تو کھائے ہی جا رہی ہے۔ موٹو کہیں کی۔ زینب کبھی دادی کو چڑیاں دکھاتی۔ کبھی امی کو بلاتی۔ کبھی ابا کو کھینچ

لاتی۔سب اس کی خوشی میں خوش تھے۔

کچھ دن یہ سلسلہ بڑے مزے سے چلتا رہا۔زینب روز صبح پیالوں میں دانہ پانی رکھ دیتی اور دیر تک چڑیوں کا کھیل دیکھتی رہتی۔

ایک دن نہ جانے کہاں سے ایک بلی اُدھر آنکلی۔اس نے جو چڑیوں کا شور سنا تو اپنے لیے بڑھیا موقع جانا۔دبے پاؤں آگے بڑھی۔وہ تو خیر ہوئی کہ چڑیوں نے اسے دیکھ لیا۔وہ ساری کی ساری چوں چوں چوں چوں کرتی اڑ گئیں۔زینب کی امی نے بلی کو بھگایا لیکن وہ برابر والے گھر کی دیوار پر جا کر بیٹھ گئی۔اب چڑیاں بھلا کیسے آتیں۔

پھر زینب کو ایک ترکیب سوجھی۔وہ اپنا کھلونا کتا اٹھالائی جو اس کے چچا دبئی سے لائے تھے۔وہ کتا دیکھنے میں جتنا خوبصورت تھا،ویسی ہی اس کی آواز بالکل اصل کتے جیسی تھی۔جب چچا نے پہلی مرتبہ یہ کھلونا کتا اسے چلا کر دکھایا تھا تو زینب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔زینب نے کتے کو آنگن میں رکھ کر چلا دیا۔کھلونا کتا آگے پیچھے گھوم گھوم کر بھونکنے لگا۔اس کی آواز سن کر بلی کچھ چونکی ضرور ہوئی لیکن بھاگی نہیں کیونکہ کھلونا کتا چھوٹا سا تھا اور بلی سے کافی دور تھا۔دوسری طرف کتے کی آواز سے چڑیاں بھی دور بھاگ گئیں۔

اب تو زینب سچ مچ بہت اداس ہوئی۔کیا کیا جائے۔جب تک بلی جائے گی نہیں،چڑیاں دانہ چگنے کیسے آئیں گی۔ابا دفتر سے لوٹے تو زینب نے بلی کی شکایت ان سے کی۔انھیں بھی کوئی ترکیب بلی کو بھگانے کی سمجھ میں نہ آئی۔جب امی نے ابا کو بتایا کہ زینب دن بھر بہت اداس رہی ہے تو وہ اسے بہلانے کو بازار لے گئے۔بازار میں آئس کریم خریدتے وقت ابا کو اپنے دفتر کے صمد صاحب ملے۔زینب نے ان کو سلام کیا۔

''کیا بات ہے۔بچی کچھ سست دکھائی دے رہی ہے۔کیا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''صمد صاحب نے سوال کیا۔

ابا نے ہنستے ہوئے ان کو پوری بات بتائی۔کھلونے کتے کا واقعہ بھی بیان کر دیا۔صمد صاحب بھی ہنسنے لگے۔پھر بولے ''بیٹی کا آئیڈیا تو بہت اچھا تھا لیکن کتا اصلی ہونا چاہیے تھا۔ایسا کرتے ہیں کہ کل میں اپنا کتا لے کر آپ کے گھر آجاؤں گا۔اگر بلی آس پاس موجود ہوئی تو میرا شیرو اسے دور بھگا دے گا۔

''کیوں بیٹی ٹھیک ہے نا۔'' زینب کا چہرہ کھل اٹھا۔اس نے جلدی جلدی ہاں میں سر ہلایا۔

اگلے دن اتوار تھا۔صمد صاحب حسب وعدہ اپنا کتا لے کر آگئے تھے۔جیسے ہی چڑیاں آنی شروع ہوئیں،بلی بھی نہ جانے کدھر سے آٹپکی۔وہ دیوار سے کودنے ہی والی تھی کہ صمد صاحب نے شیرو کو چھوڑ دیا۔شیرو زور زور سے بھونکتا ہوا بلی پر جھپٹا۔بلی اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔گھبرا کر نیچے گر پڑی۔اسے سخت چوٹ آئی۔پھر بھی جان بچانے کو آنگن کی نالی میں سے باہر کو بھاگی۔شیرو بھی پچھلے دروازے سے اس کے پیچھے بھاگا۔

صمد صاحب نے کہا ''بس بیٹا۔اب شیرو بلی کو اتنی دور بھگا دے گا کہ وہ واپس ادھر نہیں آئے گی۔زینب نے اور ابا نے بھی صمد صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

بلی واقعی پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئی اور چڑیاں پھر سے دانے چگنے لگیں اور زینب کی خوشی لوٹ آئی۔

■

Dr. Zeba Farooqui
G C IV, 0/3 Ganga Nahar Colony
Lal Diggi
Aligarh - 202001 (UP)

سردی

ہر موسم اچھا ہوتا ہے قدرت کا تحفہ ہوتا ہے
تحفہ سستا ہو یا مہنگا جو بھی دے داتا ہوتا ہے
گرمی مشروبات پلائے پھل سبزی بھی خوب کھلائے
ہلکے پھلکے پیراہن کا بچہ بچہ لطف اٹھائے
لیکن کب تک رہتی گرمی اس کے دل میں بھی ہے نرمی
بولی ہم سے جاتے جاتے گوری بہنا ہے محترمی
شیام بہن دل میں مسکائی گوری سردی، ہنستی آئی
چھٹی مل گئی اکتاہٹ سے موٹے اونی کپڑے لائی
موزے جوتے عزت پائیں پالش سے چہرہ چمکائیں
ٹوپی مفلر صدری کوٹ بچوں بوڑھوں کو گرمائیں
کھانے کی تو بات نہ پوچھو کیا کیا کھاتے ہو یہ سوچو
بھاپ اڑتی جب پکوانوں سے منہ میں پانی آئے دیکھو
انڈا گوشت دودھ ملائی ہیں سردی میں سب کے بھائی
پوری پراٹھا شیرمال کھاکر گال میں سرخی آئی
آگ بڑی نعمت بھی ہے سردی کی حاجت بھی ہے
آگ اگر نفرت کی بھڑکی دنیا کی فرصت بھی ہے
الفت کی جب آگ جلے گی نفرت کی دیوار گرے گی
رام، محمد، اللہ، ایشور
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلے گی

■

Firdaus Bano Falahi
A-187/3 IInd Floor, Shaheen Bagh
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

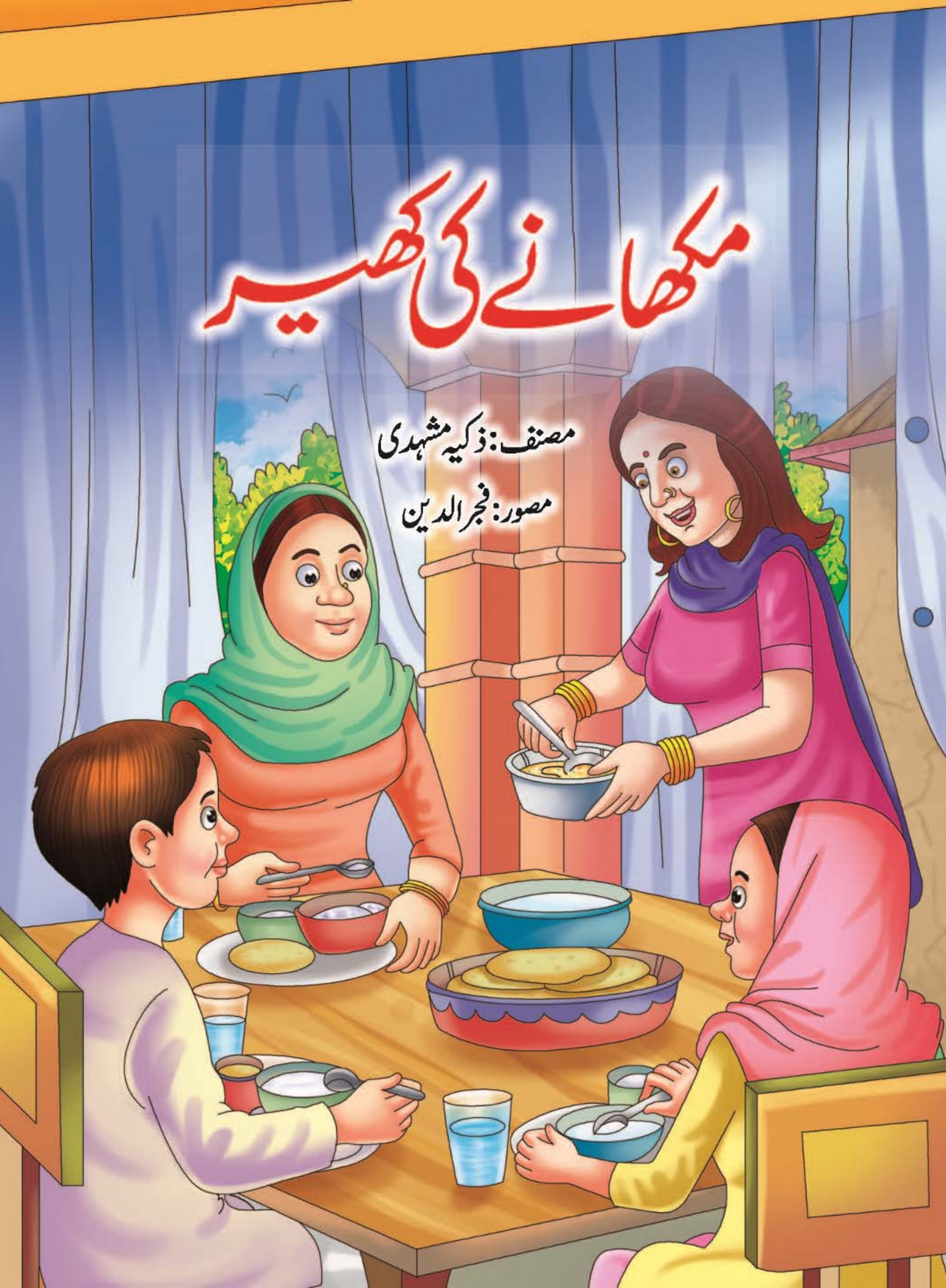
مکھانے کی کھیر
مصنف: ذکیہ مشہدی
مصور: فجر الدین

تابش جب سے اپنے دوست راجن کے یہاں دیوالی کے موقع پر مکھانے کی کھیر کھا کر آئے تھے۔ اپنی ممی کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ممی آپ مکھانے کی کھیر کیوں نہیں بناتیں۔ بہت مزے دار ہوتی ہے۔ ”اب ہر چیز ہر گھر میں نہیں بنتی۔ لیکن ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔ بنا دوں گی۔“ ممی نے جواب دیا۔ کچھ دن تک تابش خاموش رہے۔ ممی بھی بھول گئیں۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن ایک دن ہوا یوں کہ راجن اپنے ٹفن میں ایک کٹوری میں مکھانے کی کھیر لے آیا۔ اس نے تابش کو دعوت دی۔ ''ادھر دیکھ کیا ہے۔'' تابش نے گردن پھوڑائی۔

ارے واہ! انھوں نے نعرہ لگایا۔ مکھانے کی کھیر۔ آدھی سے زیادہ چٹ کر گئے اور گھر
آکر پھر وہی رٹ۔
ممی آپ مکھانے کی کھیر کیوں نہیں بناتیں۔
"ارے بھائی کھا تو آئے ہو۔" انھوں نے ٹالنا چاہا۔
"نہیں آپ بھی بنائیے تو ہم ایک ساتھ بہت سی کھائیں۔ فرج میں بنا کر رکھ دیجیے
گا تو ہم لے لے کے کھاتے رہیں گے۔"
اللہ رے نویدے۔ تابش کی بڑی بہن نے چڑایا۔
"آپ کھا کے دیکھنا۔ تم بھی یہی کہوگی۔ بلکہ مل جائے تو یہی کروگی۔"
"کیا؟"
"فرج سے نکال نکال کے کھاتی رہوگی۔"

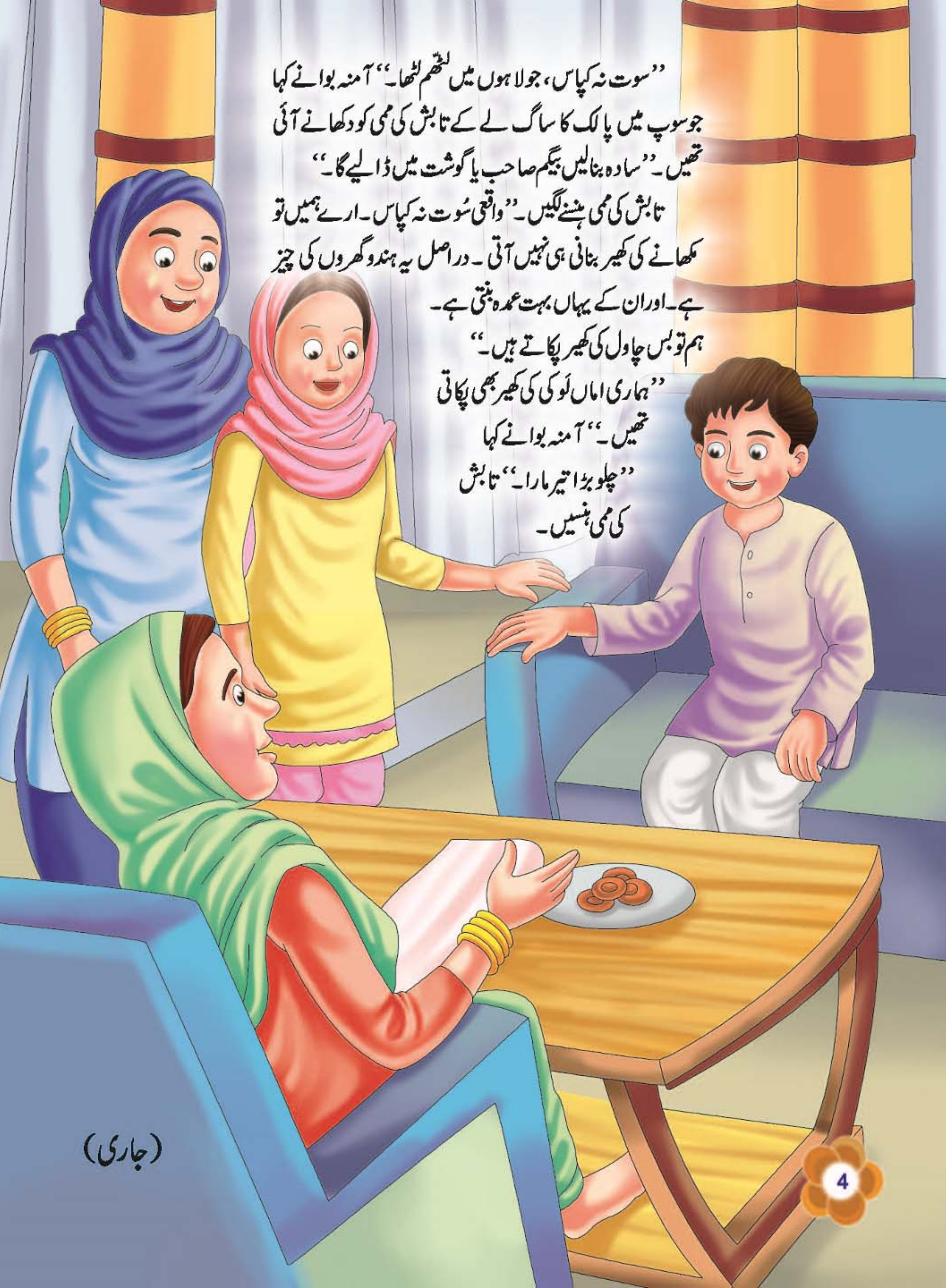

”سوت نہ کپاس، جولاہوں میں لٹھّم لٹھا۔“ آمنہ بوا نے کہا جو سوپ میں پالک کا ساگ لے کے تابش کی ممی کو دکھانے آئی تھیں۔ ”سادہ بنالیں بیگم صاحب یا گوشت میں ڈالیے گا۔“

تابش کی ممی ہنسنے لگیں۔ ”واقعی سُوت نہ کپاس۔ ارے ہمیں تو مکھانے کی کھیر بنانی ہی نہیں آتی۔ دراصل یہ ہندو گھروں کی چیز ہے۔ اور ان کے یہاں بہت عمدہ بنتی ہے۔ ہم تو بس چاول کی کھیر پکاتے ہیں۔“

”ہماری اماں لوکی کی کھیر بھی پکاتی تھیں۔“ آمنہ بوا نے کہا

”چلو بڑا تیر مارا۔“ تابش کی ممی ہنسیں۔

(جاری)

مصنف: جولز ورنے
مترجم: شکیل صدیقی

ساتویں قسط

زمین کی تہہ میں

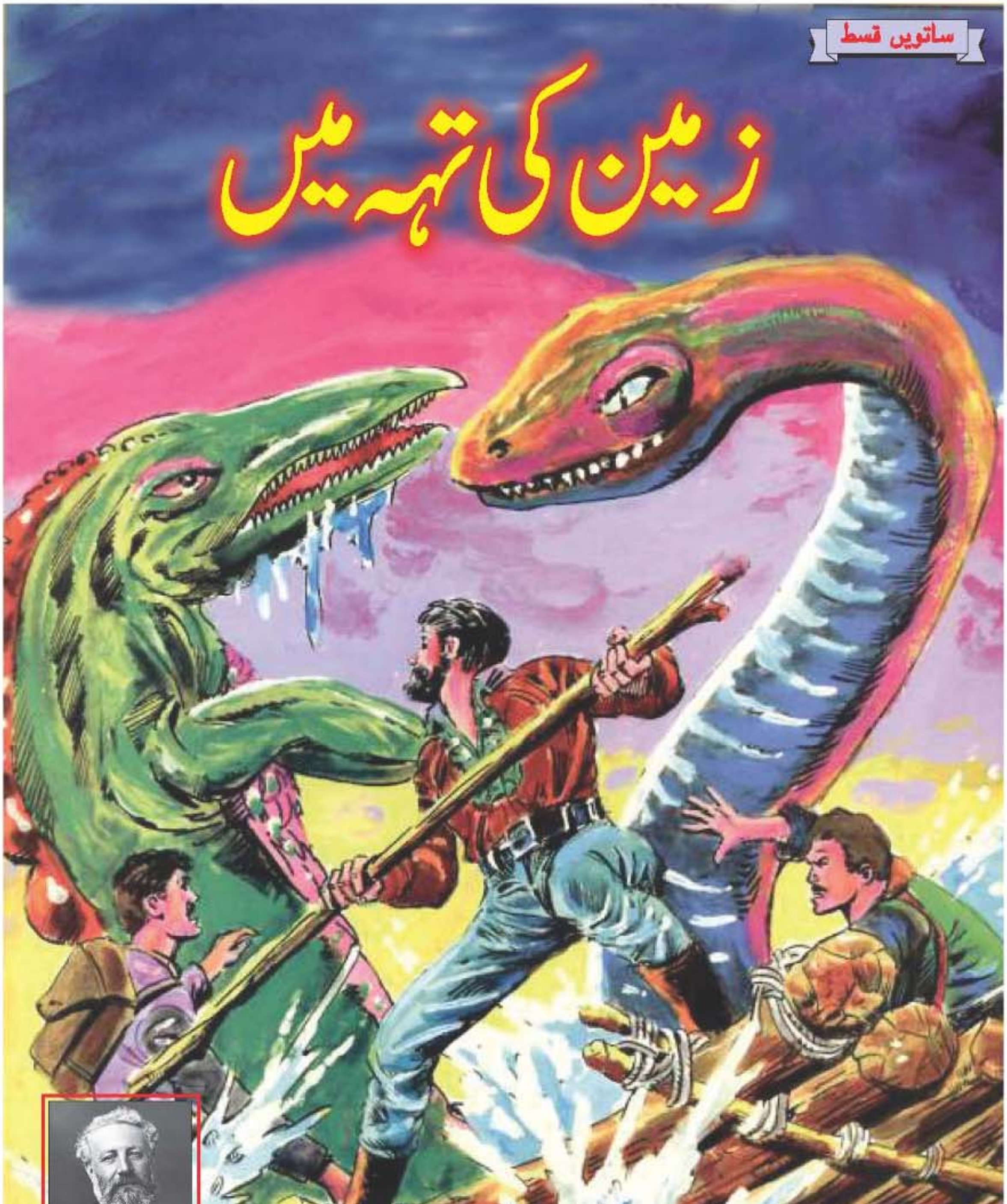

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرائیں اور ثقافتی، تاریخی و تہذیبی معلومات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، ارضیاتی اور سائنسی معلومات بھی فراہم کریں۔ یہ ناول پہلے فرانسیسی زبان میں 1864 میں لکھا گیا تھا۔ اِس ناول کا ترجمہ اردو سمیت دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اِس ناول کے مصنف جولز ورنے ہیں جو عالمی ادب میں فادر آف سائنس فکشن کے طور پر مقبول ہیں۔ ان کے ایک ناول Around the World in Eighty Days کو بہت زیادہ شہرت ملی تھی جس کو آپ نے 'بچوں کی دنیا' میں قسط وار پڑھا بھی ہے۔ جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔ 'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ یہ پروفیسر لائڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔ عجیب و غریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اِس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔ اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب و غریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات و ارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی، انھیں پرانی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتا دیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔ تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔ بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گیا۔ آخرکار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اِس خطرناک سفر پر نکل گئے۔ سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔ آئس لینڈ پہنچنے کے بعد ایک رات آرام کیا اور پھر دوسرے دن صبح وہاں کے مشہور آتش فشاں سینی فلز کا سفر شروع کیا۔ یعنی فلز پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھا۔ کئی طوفان اور دیگر پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے چچا بھتیجے سینی فلز کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ چوٹی سے اب آتش فشاں کے اندر اترنے کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ دونوں لوگ سنبھل سنبھل کر زمین کی تہہ میں اترنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد دونوں تقریباً دس ہزار فٹ نیچے پہنچتے ہیں جہاں انھیں ایک عجیب و غریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ آتش فشاں کے لاوے بکھرے پڑے تھے اور ان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دونوں ایک سرنگ میں داخل ہوئے اور سات گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کھلی جگہ میں پہنچے جہاں پودوں اور جانوروں کے ڈھانچے موجود تھے۔ اب دونوں کے پاس پینے کا پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔ سفر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ چٹانوں سے گزرتے ہوئے وہ سب ایک سرنگ میں پہنچے۔ سرنگ سے آگے انھیں کوئلے کی ایک کان ملتی ہے۔ کان میں آگے راستہ بند تھا اس لیے واپس لوٹے، جب تک پینے کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ پانی کی کمی کی وجہ سے حالات مزید خراب ہو گئے۔ پروفیسر واپس جانے کو تیار نہیں تھے جبکہ البرٹ اور ہانس کو اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ کوئلے کی کان کے بعد تانبے اور ابرق کی کانوں سے گزرتے ہوئے دو دن اور بیت گئے۔ سارے لوگ نڈھال ہو چکے تھے۔ اس درمیان ایک دریا میں پانی بہنے کی آواز آتی ہے۔ بڑی مشکل سے چٹان توڑ کر ہانس نے پانی پینا چاہا لیکن یہ دریا گرم پانی کا تھا۔ بعد میں یہ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ اب آگے

سمندر کے نیچے

دوسرے دن ہم اس سفر کی ساری پریشانیاں بھول چکے تھے۔ پہلے مجھے حیرت ہوئی کہ پیاس کیوں نہیں لگ رہی ہے۔ پھر یاد آیا کہ میرے پیروں کے نیچے چشمہ بہہ رہا ہے۔ ہم نے ناشتہ کیا اور پھر اس زمین دوز چشمے کا صحت افزا پانی پیا۔ اس سے میری طبیعت بشاش ہوگئی۔ میرے چچا جو مضبوط ارادوں کے مالک تھے۔ آخر اس سفر میں کامیاب نہ رہتے جبکہ انھیں ہانس جیسا محنتی اور مخلص گائڈ اور مجھ سا محبت کرنے والا بھتیجا ملا تھا۔ اگر کوئی یہ تجویز پیش کرتا کہ ہمیں سینی فلز کی چوٹی پر واپس چلنا چاہیے تو میں اس سے انکار کر دیتا۔

بہر حال ہر صورت میں ہمیں زمین کی تہہ میں اترنا تھا۔

''آیئے اپنا سفر شروع کریں۔'' میں نے چلا کر کہا۔

جمعرات 9 جولائی کی صبح آٹھ بجے ہم نے اپنا سفر پھر سے شروع کر دیا۔ پہاڑی چشمے کا پانی بل کھاتا اور اِدھر اُدھر مڑتا بہتا رہا لیکن اس کا رخ جنوب مشرق ہی کی طرف رہا۔ میرے چچا قطب نما سے سمت دیکھتے رہتے تھے۔

یہاں پر ڈھلان بہت کم تھی۔ چشمہ ہمارے پہلو میں بہہ رہا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی مہربان فرشتہ ہے جو ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ میں خوش تھا، مگر میرے چچا نہیں تھے۔ وہ اس پر بڑبڑا رہے تھے کہ راستہ افقی کیوں ہے اسے عمودی ہونا چاہیے تھا!

اس دن اور اس کے بعد دوسرے دن ہم نے ایک لمبا سفر کیا، مگر ہم گہرائی میں کم ہی گئے۔

جمعہ 10 جولائی کی شام ہم نے حساب لگایا کہ ہم ریکیاوک کے جنوب مشرق میں پچھتر میل اور سات میل گہرائی میں پہنچ چکے ہیں۔

اچانک ہمیں اپنے قدموں کے نزدیک ایک خلا نظر آیا جسے دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا، مگر میرے چچا نے خوشی سے تالی بجائی۔

''اب ہم اپنا سفر تیزی سے جاری رکھ سکتے ہیں۔'' وہ چلائے۔ ''کوئی پریشانی اٹھائے بغیر۔ اس چٹان میں جو کنواں سا نظر آرہا ہے یہ نیچے اترنے کے لیے زینے کا کام دے گا۔''

ہانس نے احتیاط سے ہماری کمر کے گرد رسی لپیٹی اور پھر ہم نے اس کنویں میں اترنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک میں اس کا عادی ہوگیا تھا لہٰذا مجھے ڈر محسوس نہیں ہوا۔

ہمارے چاروں طرف گولائی میں تہہ دار چٹانیں تھیں، جن کو ہم زینوں کی طرح استعمال کر کے نیچے جا رہے تھے۔ ہر پندرہ منٹ بعد ہم کسی چٹان پر بیٹھ کر آرام کرتے اور کھانے کے دوران باتیں کرتے جبکہ پینے کے لیے چشمے کا پانی موجود تھا۔ چشمہ آگے جا کر ایک آبشار میں تبدیل ہوگیا اور اب اس میں ہماری ضرورت سے زیادہ پانی تھا۔

گیارہ اور بارہ جولائی کو بھی ہم بدستور اس کنویں کے زینے طے کر رہے تھے۔ اس طرح سے ہم مزید پانچ میل گہرائی میں چلے گئے۔ اب ہم سطح سمندر سے تیرہ میل نیچے پہنچ چکے تھے۔ تیرہ جولائی کو راستہ مزید آسان ہوگیا۔ اس وقت ہم پینتالیس درجے کی ڈھلان پر جنوب مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ اب گرد و پیش میں کوئی جاذب نگاہ منظر نہیں رہا تھا اس لیے اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ بدھ پندرہ جولائی کو پروفیسر کے حساب کے مطابق ہم اٹھارہ میل نیچے جا چکے تھے اور سینی فلز سے ایک سو پچیس میل دور پہنچ چکے تھے۔ جب میں نے یہ بات سنی تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔

''تم کیا سوچ رہے ہو میرے بچے؟'' انھوں نے کہا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ اگر آپ کا حساب درست ہے تو ہم

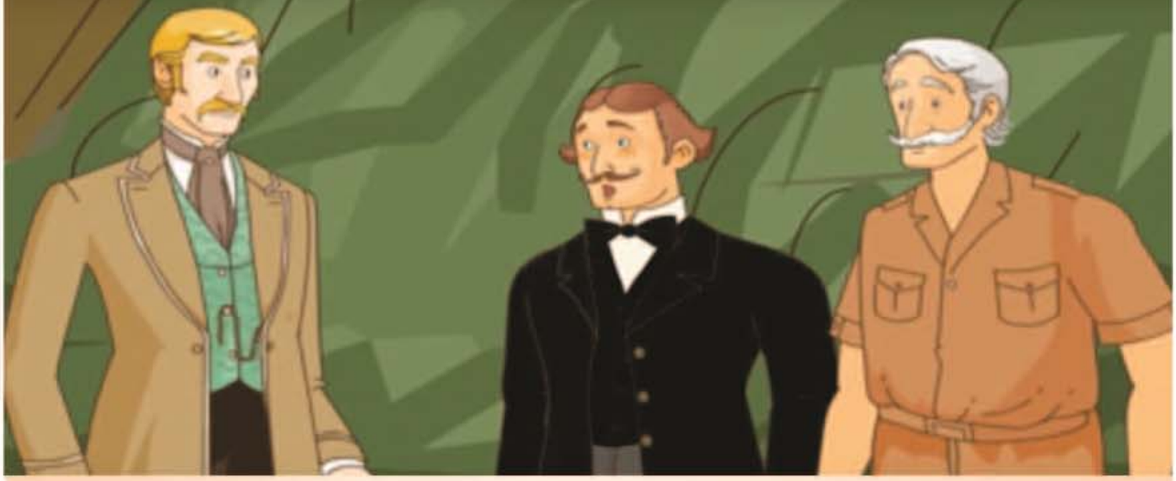

آئس لینڈ کے نیچے پہنچنے والے ہیں۔"

"اوہ ایسی بات ہے؟"

"ہاں۔ ہم اس کو چیک کر سکتے ہیں۔"

میں نے نقشا دیکھا اور چند پیمائشیں کیں۔

"میں صحیح کہہ رہا تھا۔" میں نے کہا "ہم یقیناً کیپ پورٹ لینڈ سے گزر چکے ہیں اور اس وقت سمندر کے نیچے جنوب مغرب میں ہیں۔"

"سمندر کے نیچے۔" ہمارے چچا نے مسرت سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ سمندر اس وقت ہمارے سروں کے اوپر ہے۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے البرٹ؟" کیا شمالی انگلستان میں ایسی کوئلے کی کانیں نہیں ہیں جو سمندر کے نیچے تک چلی گئی ہیں۔"

یہ قدرتی بات تھی، مگر مجھے پسند نہیں تھا کہ میرے سر پر اتنا بڑا پہاڑ یا سمندر ہو۔

چار روز بعد، ہفتہ اٹھارہ جولائی کو ہم گرینائٹ چٹانوں کے ایک بڑے سے ہال میں پہنچ گئے۔ میرے چچا نے ہانس کو اس کی ہفتے بھر کی اجرت ادا کی۔ یہ طے پایا کہ اگلے دن آرام کیا جائے۔

اس لیے ہفتے کی صبح میں بہت کاہلی سے اٹھا۔ ہم اب اپنا وقت زمین کی تہہ میں گزار رہے تھے۔ مجھے شاید ہی کبھی سورج، ستاروں یا درختوں اور قصبوں کا خیال آتا تھا۔ اس لیے کہ ہم تو زمین کے نیچے دبی ہوئی معدنیات کی طرح بے جان تھے جنھیں ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ہمارا وفادار چشمہ اب بھی نزدیک ہی بہہ رہا تھا۔ ہم اس وقت اتنا سفر کر چکے تھے اور اتنا آگے آ چکے تھے کہ اس کا پانی اب ہمیں ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا اور ہم اسے بلا جھجک پی سکتے تھے۔

ناشتے کے بعد پروفیسر نے کہا "جب ہم جرمنی واپس جائیں گے تو میں اس زیرِ زمین سفر کا نقشا بناؤں گا۔"

"چچا یہ کام تو بہت دلچسپ رہے گا، مگر کیا آپ نے تمام چیزوں کا بغور مشاہدہ کر لیا ہے؟"

"ہاں۔ میں نے ہر موڑ اور ہر ایک ڈھلان کی پیمائش اور اس کا زاویہ اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا ہے۔ قطب نما دیکھ کر بتاؤ کہ ہم کس سمت میں سفر کر رہے ہیں۔"

میں نے قطب نما دیکھ کر کہا۔ "جنوب سے مشرق کی

طرف۔"

"بہت خوب!" پروفیسر نے کہا، پھر جلدی سے حساب لگا کر بولے۔ "میرے حساب کے مطابق ہم نے جہاں سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہاں سے یہاں تک دو سو تیرہ میل طے کر چکے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم بحر اوقیانوس کے نیچے ہیں؟"

"ہاں بالکل۔"

"ممکن ہے اس وقت ہمارے سروں پر طوفان آ رہا ہو اور بحری جہاز اچھل رہے ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"اگر آپ درست کہہ رہے ہیں تو اس وقت درجہ حرارت لازمی طور پر ڈیڑھ ہزار سینٹی گریڈ ہونا چاہیے۔"

"لازماً ہونا چاہیے میرے بچے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اور گرینائٹ کی ان چٹانوں کو لازماً پگھل جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"مگر تم دیکھ رہے ہو گے یہ نہیں پگھل رہی ہیں۔ تھرمومیٹر کیا بتا رہا ہے۔" وہ بولے۔

"ہوں۔"

"اور ہمارے اس سرنگ نما راستے کے اوپر وھیل اپنی دُمیں ہلا کر ہلچل مچا رہی ہوں؟"

"اس بارے میں فکرمند مت ہو البرٹ وہ ان چٹانوں کو نہیں ہلا سکتیں۔ آؤ ایک بار پھر اندازہ لگائیں کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہم سینی فلز کے جنوب مشرق میں دو سو تیرہ میل آگے پہنچ چکے ہیں اور اس وقت سطح سمندر سے اڑتالیس میل نیچے ہیں۔" وہ بولے۔

"اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ زمین کی اوپری تہہ کی آخری حد ہے۔" میں نے کہا۔

"ستائیس عشاریہ چھ درجہ۔" میں نے جواب دیا۔

"اس طرح سے سائنس داں چودہ سو بہتر اعشاریہ چار درجہ غلط ہیں اور ہمفرے ڈیوی کا کہنا صحیح ہے، تم اس بارے میں کیا کہتے ہو۔" وہ بولے۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے اب بھی زمین کے مرکز کی گرمی والی تھیوری پر یقین تھا، حالانکہ مجھے گرمی نہیں لگ رہی تھی۔ غالباً ان چٹانوں کے پیچھے موجود لاوا گرمی اور حدت کو ہم تک پہنچنے سے روک رہا تھا، مگر میں نے چچا کے سامنے یہ دلیل پیش نہیں کی اور موضوع ہی تبدیل کر دیا۔

''چچا جان۔'' میں نے کہا۔ ''آئس لینڈ پر زمین کا نصف قطر چار ہزار آٹھ سو میل ہوتا ہے نا؟''

''ہاں۔''

''او ہم اس میں سے اڑتالیس میل طے کر چکے ہیں۔''

''ہاں۔''

''تقریباً بیس دنوں میں۔''

''تقریباً بیس دنوں میں۔'' چچا نے جواب دیا۔

''اس حساب سے زمین کے مرکز تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو ہزار دن درکار ہوں گے۔ یعنی تقریباً ساڑھے پانچ سال۔''

پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اس کے علاوہ اگر ہم ہر اڑتالیس میل نیچے کی طرف جانے کے بعد دو سو تیرہ میل سامنے کی طرف چلیں تو ہم زمین کے مرکز تک پہنچنے سے پہلے سطح پر دوبارہ نکل آئیں گے۔''

''اپنا یہ سارا حساب فراموش کر دو۔'' میرے چچا نے برہمی سے کہا۔ ''ایک شخص یہ سفر کر چکا ہے اور اب میں بھی کروں گا۔''

''مجھے بھی امید ہے مگر.....''

''اپنی زبان کو لگام دو اور فضول باتیں نہ کرو۔ بس مونو میٹر کی طرف دیکھتے رہو۔ اس پر کیا ظاہر ہو رہا ہے؟''

''اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آگے کافی دباؤ ہے۔''

''خوب! اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جیسے جیسے ہم بتدریج نیچے جا رہے ہیں ہمارے جسم اس ہوا کو برداشت کرتے جا رہے ہیں اور ہمیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑ رہی ہے۔''

''سوائے اس کے کہ کانوں میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔''

''اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جلدی جلدی سانس لے کر اس درد سے نجات پائی جا سکتی ہے۔''

''یقیناً۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اپنے چچا کی مخالفت کر کے انھیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا ''اتنا نیچے آنا خوش گوار لگ رہا ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہے کہ یہاں آ کر ہمیں کتنا صاف اور واضح سنائی دے رہا ہے؟''

''ہاں۔ مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔''

''کشش ثقل میں اضافہ تو نہیں ہو جائے گا؟'' میں نے کیا پوچھا۔

''ہوگا۔ کشش ثقل بڑھتی جائے گی اور ہم لوگ ہلکے پھلکے ہوتے چلے جائیں گے۔'' وہ بولے۔

''پھر ہم کیسے مسلسل نیچے کی طرف سفر جاری رکھ سکیں گے۔'' میں نے پھر سوال کیا۔

''ہمیں اپنی جیبوں میں پتھر بھرنا پڑیں گے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''چچا جان آپ کے پاس ہر سوال کا جواب موجود رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔

بہر حال ایک سوال ایسا تھا کہ جس کا چچا جان جواب نہیں دے سکتے تھے اگر چہ آرنی نے یہ سفر کر لیا تھا جب کے اس کے زمانے میں مونو میٹر بھی ایجاد نہیں ہوا تھا تو اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ زمین کے مرکز تک پہنچ چکا ہے؟

لیکن میں نے چچا سے یہ سوال نہیں کیا۔ اتوار کا دن ہم نے باتیں کر کے اور پیمائش کر کے گزارا۔ میں نے احتیاط برتی اور چچا سے کوئی مخالفت مول نہیں لی۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سید مرتضیٰ سید خالق

اقوالِ زرّیں

- بے مقصد زندگی سمندر میں ڈولتی ہوئی اس کشتی کی مانند ہے جس کو اپنے ساحل کا علم نہیں۔
- سچا دوست وہ ہے جو آپ کی طرف اس وقت آئے جب ساری دنیا آپ کا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔
- دنیا میں ساری چیزیں ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں مگر صرف انسان ہی ہے جو ٹھوکر لگنے کے بعد ترقی کرتا ہے۔
- اپنے آپ کو اتنا مت گراؤ کہ دوسرے تمھیں حقیر سمجھیں۔ جانتے نہیں کہ گرے ہوئے مکان کی تو لوگ اینٹیں بھی اٹھالے جاتے ہیں۔

■
Sayyed Murtaza Sayyed Khalique
Rasulpur Ta. Raver,
Distt.: Jalgaon - 425508 (Maharashtra)

واثق محمد فضل اللہ رومی

علم اور عقل

تعلیم کی ہمیشہ اہمیت رہی ہے۔ اب سبھی کو اس کا احساس ہونے لگا ہے، پہلے معلومات کے ذرائع کم تھے۔ لیکن بعد میں لوگ تعلیم کی اہمیت کو سمجھنے لگے۔ ہمارے نبی حضرت محمدؐ نے بھی علم کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ آج پوری دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں کا بول بالا ہے۔ دنیا ایک دوسرے سے بالکل جڑ گئی ہے۔ اس لیے، ہم سبھی کو علم کی طرف توجہ دینے کی بہت ضرورت ہے۔ خدا نے انسان کو دوسری مخلوقات سے بہتر اسی لیے بنایا ہے کہ انسان علم اور عقل سے مالا مال ہے۔ آج علم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم سبھی کو علم حاصل کرنے کی جانب توجہ دینی چاہیے۔ ہم تعلیم سے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں اور دنیا کو سمجھنے، زندگی کو بہتر ڈھنگ سے گزارنے کا سلیقہ ہمیں تعلیم سے ہی آتا ہے۔

■
W.M. Fazlullah Roomy
43, Baranakkara, 4th Street
Roomi Manzil, Flower Garden
Ambur - 635802 (VLR Dist)

محمد سلطان

آئن اسٹائن (سائنس داں) کی ایک نایاب تصویر

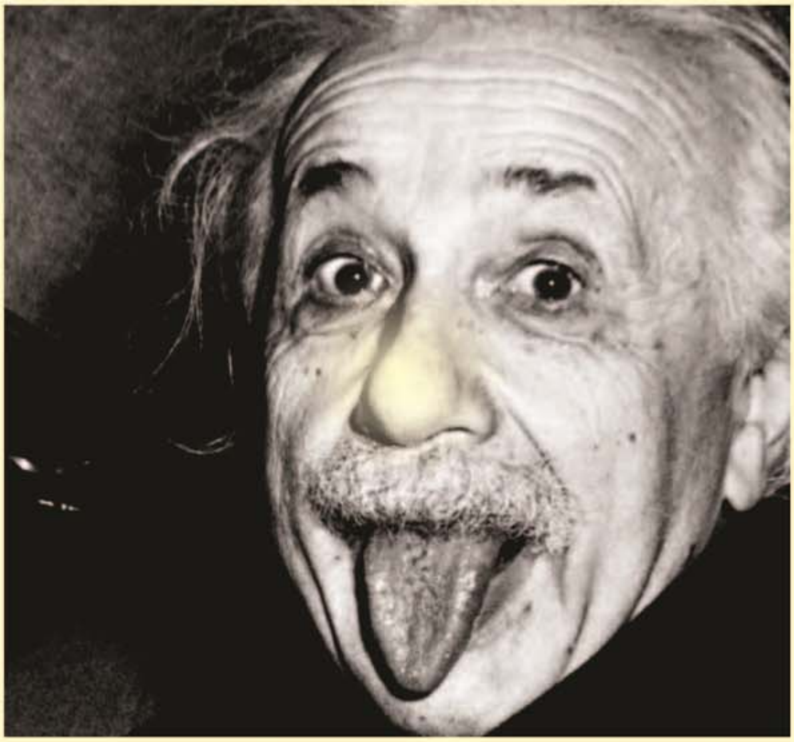

نوبل انعام یافتہ البرٹ آئین اسٹائن جیتنے والے علم طبعیات کے سائنس داں کی ایک نایاب تصویر نیلام کے لیے منتخب کی گئی ہے۔ اس تصویر میں وہ مذاقیہ انداز میں اپنی زبان منہ سے باہر نکالے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی اس تصویر پر دستخط بھی بائیں طرف درج ہے۔ دستخط شدہ یہ تصویر تقریباً ایک لاکھ ڈالر (64.36 لاکھ روپے) میں فروخت ہونے کی امید ہے۔

البرٹ آئین اسٹائن کی یہ تصویر ان کے 72ویں یومِ پیدائش پر 14 مارچ 1951 کو آرتھر ساسے نے کھینچی تھی اور فوٹوگرافر کے اس کمال کو اخبار میں چھاپنے کے لیے کافی مشکلیں جھیلنی پڑی تھیں!

نے۔ ٹی۔ ڈی۔ سینڈرس آکسنز کے مطابق یہ البرٹ آئین اسٹائن کی نایاب تصویر چھپنے کے بعد بذاتِ خود آئین اسٹائن بالکل حیرت سے دنگ رہ گئے۔ ساتھ ہی مسرت کے ساتھ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی اس نایاب تصویر کی کئی کاپیاں اپنے قریبی دوستوں، رشتہ داروں میں تقسیم کیں۔ تصویر کی بائیں طرف البرٹ آئین اسٹائن کا اپنا دستخط درج کیا ہوا ہے!!!

■

Md. Sultan
New D.S.Cable, Flat No.: 34
Cable Town, P.O: Golmuri
Jamshedpur - 831003 (Jharkhand)

سیدہ مظہر سلطانہ

مزاحیہ پیغام

یہ دنیا

دنیا صرف ایک جلی ہوئی ہانڈی ہی نہیں بلکہ اس میں مٹر کے دانوں کی طرح خلوص کے موتی بھی بکھرے ہوئے ہیں۔

ٹماٹر کی طرح سرخ پھول شلجم کی طرح بنفشی کلیاں اور پودینہ دھنیے کی طرح ہری بھری گھاس بھی ہے۔ یہاں گاجر کی طرح میٹھے دوست بھی ہیں اور کڑوے کریلوں کی طرح دشمن بھی ہیں لیکن انسان کو اس میں پالک کی طرح رہنا پڑتا ہے۔ دنیا ایک پیاز ہے۔ اس میں آنسوؤں کی طرح لڑیاں، کچی کیریوں کی طرح خوشبو ہے۔ اس لیے

ہمیں آپس میں ہمیشہ سلاد کی طرح مل جل کر رہنا چاہیے۔

زندگی کی گاڑی چلانے کے اصول

اگر زندگی کی گاڑی کو کامیابی سے چلانا چاہتے ہو تو دل کے ایکسی لیٹر Exceleter پر ہمیشہ قابو رکھو۔ دماغ کے بریک کو صاف اور آرڈر میں رکھو۔ غصے کی اِسپیڈ کو کنٹرول میں رکھو۔ سخاوت کی راہ آتے ہی ٹاپ گیئر کا استعمال کرو۔ برائی کی راہ آتے ہی ریورس گیر کا استعمال کرو۔ اپنی گاڑی میں ہمیشہ اچھے ظرف اور اخلاق کے ٹائر استعمال کرو۔ اپنی ذہنیت کو برے خیالات کے پنکچر سے بچاؤ۔ اپنی دل و دماغ کی ڈگی کو وسیع رکھو۔ زبان کی میز ریڈنگ پر ہمیشہ نظر رکھو۔ مسکراہٹ کے سائرن کا ہمیشہ استعمال کرو۔ بداخلاقی کی پالیسی سے بچنے کے لیے اپنے پاس ہمیشہ شرافت کا لائسنس ساتھ رکھو۔

Syeda Mazher Sultana
Assit. Teacher,Fatima Girls Urdu High School,Begum Pura,Aurangabad (M)

مہوش امجد خان

علم

- علم ایک سمندر کے مانند ہے۔ اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو کنارے پر نہ کھڑے رہو بلکہ گہرائی میں اترتے چلے جاؤ۔
- علم ایک ایسا پودا ہے جسے دل اور دماغ کی سرزمین میں لگانے سے عقل کے پھول لگتے ہیں۔
- علم ہی وہ منزل ہے، وہ روشنی ہے جو تمہیں تنگ سے تنگ اور باریک سے باریک راستوں سے گزر کر منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔
- علم کے پیالے کو اپنے ہونٹوں سے لگالو۔ علم کا جو بھی گھونٹ تمھارے حلق سے اتر جائے گا وہ تمھارے دل اور دماغ کو روشن کردے گا۔
- جب کسی برتن میں کوئی چیز ڈالی جائے تو وہ بھر جاتا ہے اور اس میں مزید گنجائش نہیں رہ جاتی لیکن علم کا برتن بھی نہیں بھرتا یعنی انسانی دماغ میں جتنا علم ڈالو یہ اتنا ہی فراخ ہوجاتا ہے۔
- علم سب سے بڑی دولت ہے اور جہالت سب سے بڑا افلاس، علم کے بغیر آدمی کا ایمان اور یقین پختہ نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں وہ عمل کی دولت سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

Mahvish Amjad Khan
Anglio Urdu School, Pratap Nagar
Jalgaon (Maharashtra)

آؤ اردو سیکھیں

بچو! اس شمارہ میں صرف دو حروف سیکھتے ہیں جو 'دو چشمی ہے' (ھ) سے مل کر بنتے ہیں۔ یہ بھی اردو کی بنیادی آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروف ہیں۔ د اور ڈ اپنے بعد آنے والے حرف سے نہیں ملتے اس لیے 'ھ' کو ملا کر نہیں لکھا جاتا۔

د+ھ = دھ؛ دھال धाल یا دِھے धे

ڈ+ھ = ڈھ؛ ڈھال ढाल یا ڈھے ढे

बच्चो! इस शुमारा में सिर्फ़ दो हुरूफ़ सीखते हैं जो 'दो चश्मी हे' (ھ) से मिल कर बनते हैं। ये भी उर्दू की बुनियादी आवाज़ों को ज़ाहिर करने वाले हुरूफ़ हैं। दाल (د) और डाल (ڈ) अपने बाद आने वाले हर्फ़ से नहीं मिलते इस लिए दो चश्मी (ھ) को मिलाकर नहीं लिखा जाता।

दाल (د)+ दो चश्मी हे (ھ) = धे या धाल

डाल (ڈ)+ दो चश्मी हे (ھ) = ढे या ढाल

دھ سے دھان، دھرم شالہ، دھواں، دھوبی، دھامن

धे (دھ)से धान; धर्मशाला; धुवाँ; धोबी; धामिन

ڈھ سے ڈھکن، ڈھولک، ڈھاک، ڈھال، ڈھیلا

ढे (ڈھ) से ढक्कन; ढोलक; ढाक; ढाल; ढीला

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ہنسی کے غبارے

استاد: (لڑکے سے) تمھارا سارے کا سارا مضمون غلط ہے۔ میں تمھارے والد سے شکایت کروں گا۔

لڑکا: لیکن جناب یہ مضمون میرے والد ہی نے تو لکھا ہے۔

استاد: اگر ایک اور ایک دو ہوتے ہیں اور دو اور دو چار ہوتے ہیں اور تین اور تین چھ پھر سات اور سات کتنے ہوں گے؟

شاگرد: جناب آسان والے تو آپ نے حل کر دیئے۔ مشکل والا میرے لیے چھوڑ دیا۔

ایک کلاس میں مینڈک کو بے ہوش کرنا تھا اور دوا نہیں مل رہی تھی۔ ایک لڑکے نے اٹھ کر کہا۔

''سر اسے میری جرابیں سنگھادیں۔''

سر نے کہا ''اسے بے ہوش کرنا ہے مارنا نہیں ہے۔''

ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول کا دورہ کرتے ہوئے جب ایک کلاس میں پہنچے تو وہاں بہت شور ہورہا تھا اور ایک لڑکا جوان سب میں بڑا تھا۔ سب سے زیادہ شور کررہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس کا کان پکڑ کر آفس میں لے گئے اور سزا کے طور پر ایک کونے میں کھڑا کردیا۔ کچھ دیر بعد ایک چھوٹا بچہ ہیڈ ماسٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا ''سر بہت دیر ہوگئی ہے ہمارے ماسٹر صاحب کی سزا کب ختم ہوگی۔''

ایک پروفیسر صاحب جلدی میں کہیں جارہے تھے کہ بیگم نے کہا: ''ارے پان تو کھاتے جائیں!''

پروفیسر صاحب پلٹ کر آئے، پان منہ میں رکھا اور دوبارہ چلے گئے۔ بیگم نے پھر آواز دی ''ارے وہ جوتے'' پروفیسر صاحب نے تیزی سے کہا ''بیگم مجھے دیر ہورہی ہے، آکر کھالوں گا۔''

استاد (شاگرد سے) دستک کو جملے میں استعمال کرو!

شاگرد: جناب مجھے دس تک گنتی آتی ہے۔

سائنس کے پروفیسر: یہ بتاؤ کہ سونے کو اگر کھلی ہوا میں رکھ دیا جائے تو کیا ہوگا؟

شاگرد: جناب چوری ہوجائے گا۔

گاہک تم تو کہہ رہے تھے کہ یہ کپڑا کم ہے جبکہ دوسرے درزی نے اسی کپڑے میں سے سوٹ بنایا اور اپنے پانچ سال کے ایک بچے کا کوٹ بھی بنالیا۔

درزی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں صاحب لیکن میرا لڑکا تو 12 سال کا ہے۔

نیتاجی: مجھے ووٹ دو میں آپ کے گاؤں کو جنت بنادوں گا۔

گاؤں والے: مگر صاحب ابھی تو ہمیں زندہ رہنا ہے۔

محمد طاہر صدیقی

آبدوز کی تاریخی اہمیت

جس طرح پرندوں کو ہوا میں اڑتا دیکھ کر انسان نے ہوائی جہاز بنایا، اسی طرح پانی میں تیرتی مچھلیوں کو دیکھ کر آبدوز بنانے کا خیال یقیناً کسی کو آیا ہوگا۔ پہلے یہ خیال ناممکن تھا مگر انسان کے عزم نے اسے ممکن کر دکھایا۔

دنیا کی پہلی آبدوز(Submarine) بنانے کا قابل فخر کارنامہ جس شخص نے انجام دیا وہ ہالینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کا نام کارنیلس وان ڈریبل تھا۔ اس نے 1620 اور 1624 کے درمیان ایک آبدوز تیار کی اور اسے دریائے ٹیمز میں 12 یا 15 فٹ کی گہرائی میں اتارنے میں کامیاب ہوا۔ پھر اس شعبے میں تحقیق اور مسابقت کا سفر جاری رہا اور 1775 کے بعد ڈیوڈ بشنیل نامی ایک طالب علم نے جنگی فاختہ نامی ایک آبدوز بنائی جو اخروٹ کی شکل سے مشابہ تھی۔ اس میں صرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ پھر 1801 میں رابرٹ فلٹن نامی امریکی نے فرانس میں ایک آبدوز بنائی یہ اس دور کی جدید آبدوز تھی جو لوہے اور پیتل کی شیٹ سے بنائی گئی تھی اس میں چار افراد دو جلتی ہوئی موم بتیوں سمیت تین گھنٹے زیرآب رہ سکتے تھے۔ اس آبدوز کو مرضی کے مطابق گہرائی میں اتارا یا اوپر کیا جا سکتا تھا۔ حکومت فرانس نے جب فلٹن کی اس ایجاد کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا تو وہ برطانیہ چلا آیا اور یہاں اس نے اپنی آبدوز کے ذریعے ڈورتھی نامی دو مستول کے جہاز کو تجربے کے طور پر ڈبویا۔

اس کے بعد فلٹن امریکہ چلا گیا اور وہاں کانگریس کی حمایت سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اس کا ارادہ اسٹیم انجن سے چلنے والی آبدوز بنانے کا تھا جس میں 100 افراد کی گنجائش ہو۔

مگر موت نے فلٹن کو اس کام کی تکمیل کا موقع نہ دیا اور میوٹ نامی یہ آبدوز مکمل ہوئے بغیر پانی میں گلنے لگی اور بالآخر لنگر گاہ میں ڈوب گئی۔ اس کے بعد 1880 میں ایک انگریز پادری نے بھاپ سے چلنے والی آبدوز بنائی جو پانی کے نیچے کئی میل کا سفر کر سکتی تھی۔ انھیں دنوں سویڈن کے ایک ڈیزائنر نے بھی بھاپ سے چلنے والی آبدوز بنائی جو پانی میں 50 فٹ کی گہرائی میں جا سکتی تھی۔ اس آبدوز میں پہلی مرتبہ تارپیڈو ٹیوب لگائی گئی تھی۔ پھر برقی ایجادات نے انسانی ترقی کے نئے باب کھولے۔ 1886 میں دو انگریزوں نے 50 ہارس پاور کے برقی انجن سے چلنے والی آبدوز بنائی۔ اس برقی انجن میں 100 بیٹری سیل لگے تھے جو آبدوز کو 80 میل تک سفر کرا کے ختم ہو جاتے تھے۔ سطح آب پر آبدوزوں کی رفتار 6 ناٹ فی گھنٹہ تھی۔ ایک ناٹ تقریباً ایک میل کے برابر ہوتا ہے۔ حقیقت میں انیسویں صدی کا یہ دور آبدوزوں کی ترقی کا زمانہ تھا۔ ایک فرانسیسی میرین انجینئر میکم لابوف نے 1899 میں 111 فٹ طویل آبدوز بنائی جو پانی کی سطح پر اسٹیم انجن سے اور پانی کے نیچے برقی موٹر سے چلتی تھی۔ اس نے اپنی اس ایجاد کا نام نارول رکھا۔ اس سے قبل سائمن لیک نامی ایک شخص نے پروٹیکٹر کے نام سے آبدوز بنا کر زار روس کو فروخت کی تھی۔ بیسویں صدی کے شروع ہونے کے بعد تقریباً تمام یورپی ممالک کے بحری بیڑے میں آبدوزیں شامل ہو چکی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم جب 1945 میں ختم ہوئی تو اپنے بحری بیڑے کو مضبوط کرنے کے لیے امریکہ نے ڈیزل انجن سے چلنے والی 21 آبدوزیں تیار کیں۔ جن میں خطرناک گائیڈڈ میزائل اور راڈار لگے ہوتے تھے چونکہ دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم کا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اس لیے ایٹم کی قوت سے چلنے والی آبدوز کی تیاری کا کام مختلف ممالک نے شروع کیا۔ مگر امریکہ سب سے سبقت لے جانے میں کامیاب ہو گیا، دنیا کی پہلی ایٹمی آبدوز 17 جنوری 1955 کو سمندر میں اتاری گئی۔ یہ آبدوز 320 فٹ طویل تھی۔ اس کا وزن 3530 ٹن تھا۔ پھر 1960 اور 1970 کے درمیانی عرصے میں ایسی آبدوزیں بنائی گئیں جو انتہائی جدید ہتھیاروں سے لیس ہوتی تھیں اور جو 400 فٹ سے زیادہ طویل تھیں اور ان کا وزن ساڑھے چھ ہزار ٹن سے زائد تھا۔ بحری جنگ میں دفاع کے علاوہ اب آبدوزوں سے سمندری تحقیق اور سمندر میں مختلف معدنیات کی تلاش کا کام بھی لیا جا رہا ہے۔

ایٹمی قوت سے چلنے والی آبدوزیں زیر آب مہینوں رہ سکتی ہیں اور جنگ کی صورت میں پانی کی سطح پر آئے بغیر یہ مختلف نیوکلیئر میزائل بھی فائر کر سکتی ہیں۔ آج کی جدید آبدوز مکمل ایئر کنڈیشنڈ ہوتی ہیں۔ کھانے پکانے کے لیے الیکٹرک سامان، ڈائننگ روم، چھوٹا سا سینما ہال اور عملے کے آرام کے لیے نہایت آرام دہ بستر ہوتے ہیں۔ آبدوز کا سب سے اہم مرکز اس کا کنٹرول روم ہوتا ہے۔ جہاں سے پائلٹ راستے کا تعین کرتا ہے۔ وہ اپنے سامنے لگے ہوئے ٹیلی ویژن اسکرین کے ذریعے اپنے روٹ پر آبدوز چلاتا ہے۔ آج کل جنگی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی آبدوزوں میں جدید ترین راڈار لگے ہوتے ہیں جو دشمن کی آبدوز یا بحری جہازوں کی بروقت نشاندہی کرتے ہیں اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اب بحری فوج کا اپنے عزم اور حوصلے کے بعد سب سے بڑا ہتھیار آبدوز ہی ہیں۔

■

Mohd Tahir Siddiqui
N/139-B, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

سید شریف درجہ ہشتم، نگر پریشد اردو ہائی اسکول، گھاٹنجی، ضلع ایوت محل

نمیرہ پروین درجہ ہشتم، نگر پریشد اردو ہائی اسکول، گھاٹنجی، ضلع ایوت محل

آمنہ سید، نگر پریشد اردو ہائی اسکول، گھاٹنجی، ضلع ایوت محل

صبا کوثر، درجہ نہم، نگر پریشد اردو ہائی اسکول، گھاٹنجی، ضلع ایوت محل

التمش الطاف شیخ، درجہ ہفتم
سولاپور سوشل ایسوسی ایشن اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج آف سائنس سولاپور، مہاراشٹر

الفیہ پروین بنت فیروز احمد، مہانگر پالیکا اردو مڈل اسکول نمبر 7 نائیگاؤں اکولہ، مہاراشٹر

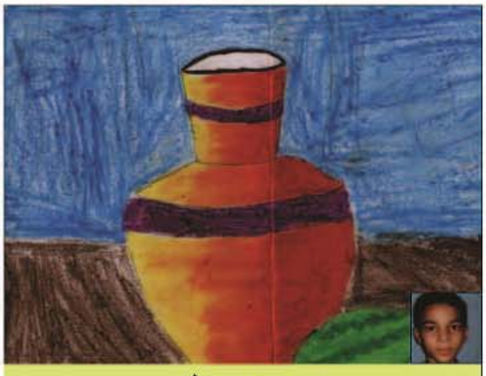

محمد زید محمد اقبال، درجہ ہفتم سی
ایس ایس اے اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج آف سائنس، سولاپور، مہاراشٹر

سفیان عارف شیخ، درجہ ہفتم
ایس ایس اے اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج آف سائنس، سولاپور، مہاراشٹر

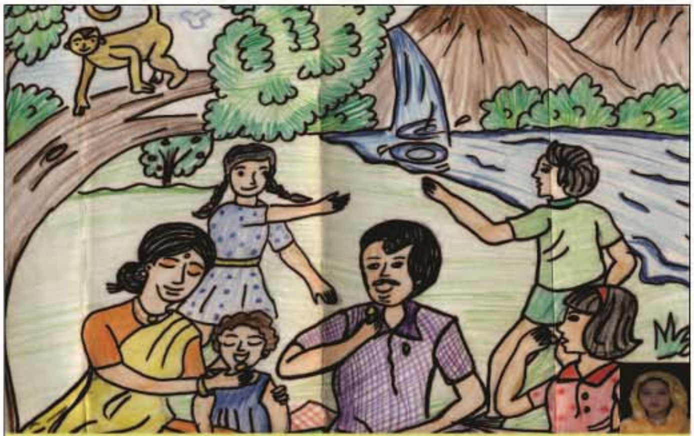

مومن فائزہ فرحت شفیق احمد، درجہ ہفتم اے، میونسپل کارپوریشن اردو اسکول، مہاراشٹر

عامر خان رضوان خان، ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول، بلڈانہ، مہاراشٹر

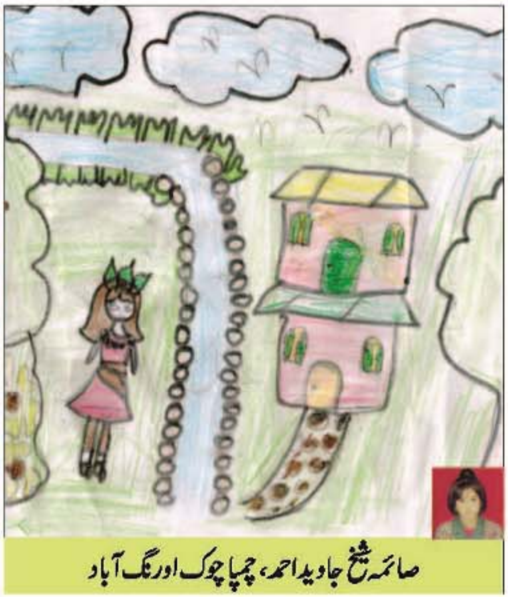

صائمہ شیخ جاوید احمد، چمپا چوک اورنگ آباد

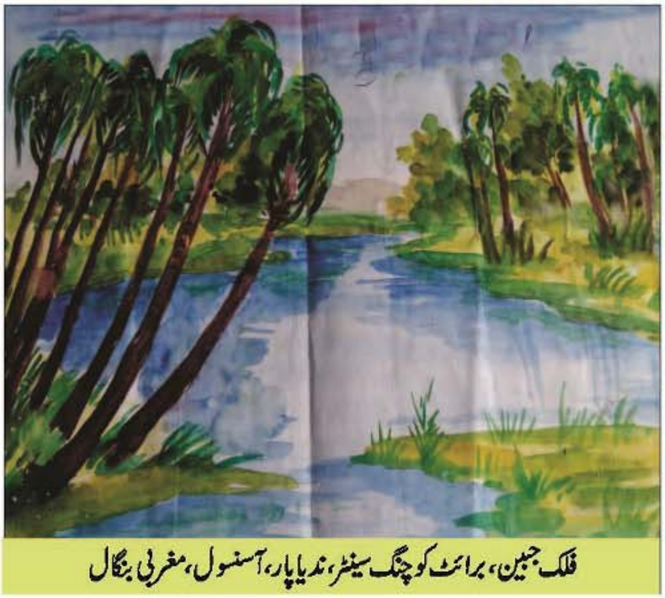

فلک جبین، برائٹ کوچنگ سینٹر، ندیا پار، آسنسول، مغربی بنگال

facebook اردو فیس بک

میرا نام عرشی فیروز ہے۔ میں کے۔جی 1 کی طالبہ ہوں۔ میرے ابو نے مجھے یومِ پیدائش پر رسالہ 'بچوں کی دنیا' بطور تحفہ دیا تھا۔ اس خوبصورت اور رنگین رسالہ کو دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گئی۔ رسالے میں شائع کہانیاں، ہنسی کے غبارے اور پینٹنگ بہت پسند آئے۔ اب میں ہر ماہ پابندی سے اس رسالے کو اپنے ابو سے منگواتی ہوں۔

عرشی فیروز، دی اسکالر اسکول، اسلام پور، مغربی بنگال، درجہ کے۔جی I

میرا نام عائشہ صدیقہ ہے۔ میں درجہ پنجم میں پڑھتی ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔

عائشہ صدیقہ اشفاق احمد، درجہ پنجم، مالیگاؤں، مہاراشٹر

میرا نام شیخ سمیر ابن شیخ منیر ہے اور میں جماعت ہشتم کا طالب علم ہوں۔ ویسے تو میں زیادہ کتابیں پڑھتا نہیں لیکن ہاں! بچوں کی دنیا نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ انکل! نصابی کتابوں کے بوجھ تلے ہم معصوم بچے اتنے دب چکے ہیں کہ دیگر معلوماتی کتابیں پڑھ ہی نہیں پاتے ہیں۔ اب ہائی اسکول میں جانے کی وجہ سے مصروفیات اور زیادہ بڑھ چکی ہیں پھر بھی وقت نکال کر یہ رسالہ پڑھتا ہوں۔ سائیکل بھی چلاتا ہوں اور کبھی کبھار ویڈیو گیم بھی کھیل لیتا ہوں۔ مجھے کمپیوٹر میں بڑی دلچسپی ہے۔ خدا نے چاہا تو میں بڑا ہو کر ایک سافٹ ویئر انجینئر بننا چاہتا ہوں۔

شیخ سمیر ولد شیخ منیر احمد، درجہ: ہشتم، سروش اردو ہائی اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' میرے ابو منگاتے ہیں۔ ہر ماہ برابر آتا ہے۔ میں دل سے پڑھتی ہوں۔ میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ ہم سب بچوں کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے اچھے اچھے مضامین اور کہانیاں شائع فرماتے ہیں۔

آرزو بانو، پنویل، مہاراشٹر

ہمارے اسکول میں جیسے ہی ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' آتا ہے ہم سب اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ 50 سے زائد کا پیاں ہم سب مل کر خریدتے ہیں۔ نہ صرف خریدتے ہیں بلکہ حرف بہ حرف شروع سے اخیر تک پڑھتے بھی ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' ہم سب کا پسندیدہ رسالہ ہے۔

خوش نما بی رئیس خان، درجہ پنجم، زیڈ پی اردو، پرائمری اسکول، رسلپور، مہاراشٹر

جولائی کا شمارہ جو کہ ادب اور سائنس کے موضوع پر تھا مجھے بہت ہی پسند آیا، خاص طور پر ریڈیم کے بارے میں جان کر مجھے بہت ہی حیرت ہوئی۔ یہ بچوں کی دنیا ہی ہے جو ہمیں ہر ماہ نئی نئی چیزوں کی جانکاری دیتا ہے۔ اسی طرح خلا میں مشاعرہ پڑھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں واقعی خلا میں سیر کر رہی ہوں اور اس مشاعرے کا حصہ ہوں۔ بچوں کی دنیا روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ اسی طرح ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

سحر اسعد، مدرسہ جامعہ رحمانیہ، مدنپورہ، وارانسی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

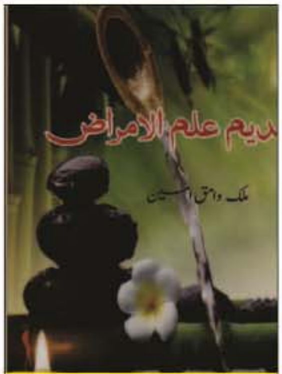

صفحات:113، قیمت: 50 روپے

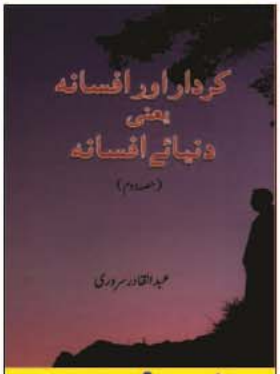

صفحات:118، قیمت: 75 روپے

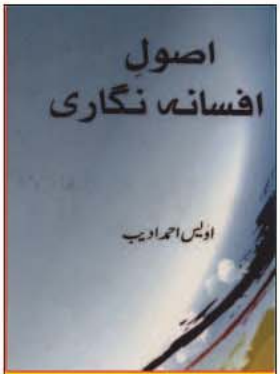

صفحات: 86 ، قیمت:65 روپے

صفحات: 136، قیمت: 80 روپے

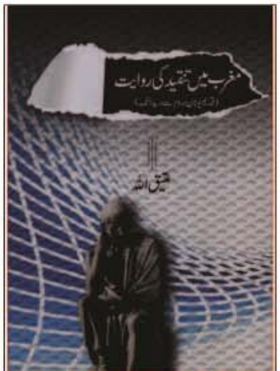

صفحات: 568، قیمت:245 روپے

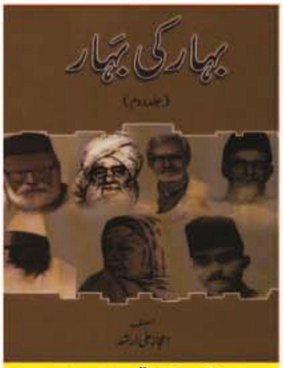

صفحات:242، قیمت:150 روپے

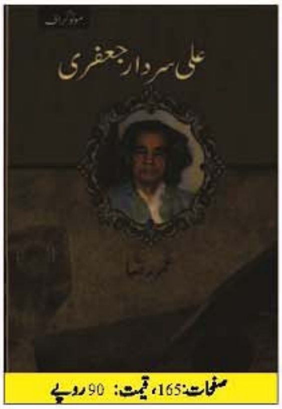

صفحات:165، قیمت: 90 روپے

صفحات: 149، قیمت:90 روپے

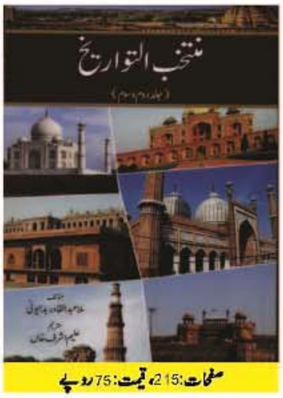

صفحات:215، قیمت:75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, December 2017, Vol. 05, Issue: 12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/11/17
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

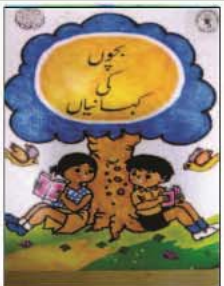

صفحات:112، قیمت:25 روپے

صفحات:108، قیمت:35 روپے

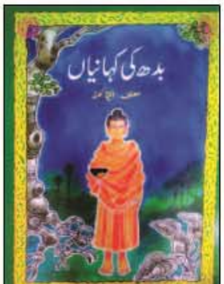

صفحات: 80، قیمت: 65 روپے

صفحات:80، قیمت:35 روپے

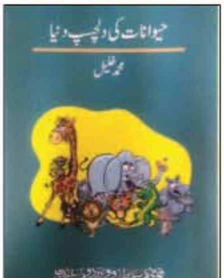

صفحات:83، قیمت:24 روپے

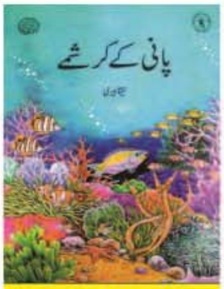

صفحات:96، قیمت:70 روپے

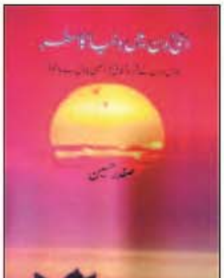
صفحات:176، قیمت:35 روپے

صفحات:164، قیمت:11 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.